سلسلۂ اشاعت تنظیمِ اسلامی۔ ۵

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی

تنظیمِ اسلامی پاکستان

مرکزی دفتر: ۶۷۔ اے علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور۔ فون: ۳۰۵۱۱۰

77/20

مطالباتِ دین

مشتمل بر

○ عبادت رب ○ فریضہ شہادت علی الناس
○ فریضہ اقامت دین

ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب و تسوید

(شیخ) جمیل الرحمٰن

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور' ۵۴۷۰۰۔فون : ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

نام کتاب ——— مطالباتِ دین

طبع اوّل تا ششم (جولائی ۱۹۷۵ء تا مارچ ۱۹۸۳ء) ——— ۱۰۷۰۰

نظرِ ثانی کے بعد:

طبع ہفتم تا دہم (جنوری ۱۹۹۳ء تا اکتوبر ۱۹۹۹ء) ——— ۶۳۰۰

طبع یازدہم (اکتوبر ۲۰۰۲ء) ——— ۱۱۰۰

ناشر ——— ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت ——— ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰

فون: ۰۴۲-۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت (اشاعت عام) ——— ۴۰ روپے

پیش لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

ہم مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے سبب مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت اسلام کے اہم ترین مطالبوں اور تقاضوں سے محجوب ہوتی چلی گئی اور ہوتی چلی آرہی ہے۔ اور اسلام کو، جو درحقیقت "دین اللہ" یعنی خدا کا نازل کردہ نظامِ حیات تھا، بنوائے آیتِ قرآنی اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ، محض ایک "مذہب" سمجھ لیا گیا اور اس کا دائرہ چند انفرادی عبادات اور معاشرتی رسوم کی ادائیگی تک محدود قرار دے لیا گیا۔ حالانکہ جب اسلام غالب نظام کی حیثیت سے قائم و نافذ نہ ہو تو ہر مسلمان کی جدوجہد اور مساعی کا اصل ہدف "اقامتِ دین" ہونا چاہئے اور اس کے لئے محنتیں کرنا، جان و مال کھپانا اور سر دھڑ کی بازی لگانا عین تقاضائے ایمان ہے اور نجاتِ اخروی کے ناگزیر لوازم و شرائط میں داخل ہے، جیسا کہ سورۃ العصر میں فرمایا گیا:

وَالۡعَصۡرِ ۝ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۝

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جب دعوت رجوع الی القرآن کے لئے جنوری ۷۲ء سے ہر ماہ کراچی تشریف لانے کا سلسلہ شروع کیا جہاں ایک خطابِ جمعہ اور تین چار دروسِ قرآن حکیم کا انتظام ہوتا تھا تو اس دوران میں موصوف نے ستمبر، نومبر اور دسمبر ۷۲ء میں مدینہ مسجد آرٹلری میدان کراچی میں خطابِ جمعہ کے موقع پر قرآنی آیات کے حوالے سے "دین کے مطالبات" پیش کئے تھے۔ ان میں سے پہلا خطاب دعوتِ اسلامی کے نکتۂ اول یعنی "بندگیٔ رب" سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے خطاب کا تعلق امتِ مسلمہ کے فرضِ منصبی اور غایتِ تاسیس سے تھا جس کا مناسب ترین عنوان ہے "فریضۂ شہادت علی الناس" ـــــ اور تیسرا خطاب امتِ مسلمہ کے فرضِ منصبی کی انجام دہی کی جدوجہد سے متعلق تھا جس کے لئے جامع عنوان ہے "فریضۂ اقامت دین"۔

یہ تینوں خطاب اس عاجز نے ٹیپ سے منتقل کر لئے تھے۔ ان میں سے اول الذکر دو خطاب "دعوتِ بندگیٔ رب" اور "فریضہ شہادتِ حق" کے ناموں سے کراچی کی ذیلی انجمن خدام القرآن کی جانب سے ۱۹۷۵ء میں شائع کئے گئے تھے۔ اپریل ۷۸ء میں اس عاجز نے اللہ کا نام لے کر ان تینوں خطابات کو یکجا کر کے "مطالباتِ دین" کے نام سے مکتبۂ تنظیمِ اسلامی کی جانب سے شائع کردیا جس کا دوسرا ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ اظہارِ حقیقت کے طور پر عرض ہے کہ کسی تقریر اور خطاب کو ٹیپ سے منتقل کرنا اور اس کے اسلوب کو تحریری شکل دینا کافی کٹھن اور مشکل کام ہے۔ صرف اللہ کے کرم اور اس کی توفیق کے سبب یہ کام انجام پاگیا۔ چونکہ یہ خطابات ڈاکٹر صاحب کی نظرِ ثانی کے بغیر شائع ہو رہے ہیں' لہٰذا ان میں زبان و انشاء اور بیان کے انداز و اسلوب میں جو کوتاہی رہ گئی ہو اس کا ذمہ اس عاجز کے کاندھوں پر ہے۔ قارئین سے گذارش ہے کہ ان کی نشاندہی ضرور فرمائیں۔ مزید برآں عرض ہے کہ ان خطابات میں آیاتِ قرآنی کے ترجمے کی بجائے عموماً ترجمانی کی گئی ہے۔ آیات کی کتابت میں صحت کا اہتمام کرنے کی بھی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔ راقم الحروف کو اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا پورا شعور ہے' اس لئے احتمال ہے کہ احتیاط کے باوجود اغلاط رہ گئی ہوں۔ اس لئے اس دعا پر اپنی معروضات ختم کرتا ہوں: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا !!

احقر
جمیل الرحمٰن
۱۵ اپریل ۸۰ء

ترتیب

عرض ناشر

زیرِ نظر کتاب "مطالباتِ دین" عرصہ پانچ چھ سال سے مفقود یعنی آؤٹ آف اسٹاک تھی۔ اس کا چھٹا ایڈیشن' جو تاحال آخری ایڈیشن تھا' مارچ ۱۹۸۳ء میں ۳۳۰۰ کی تعداد میں شائع ہوا تھا' چنانچہ ۸۶ء یا ۸۷ء میں اسٹاک کے ختم ہوجانے کے بعد سے مکتبہ میں یہ کتاب دستیاب نہیں تھی۔ اس کی اشاعت کو روک لینے کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ "فرائضِ دینی کا جامع تصور" کے نام سے ایک مختصر کتابچہ اس دوران منصۂ شہود پر آچکا تھا جس میں اختصار کے ساتھ وہ مباحث موجود تھے جو "مطالباتِ دین" میں تفصیلاً مذکور ہیں۔ ثانیاً ہماری خواہش یہ تھی کہ اس کتاب کی دوبارہ اشاعت سے قبل اس کے حسنِ ظاہری میں اضافے کے لئے اس کی کتابت دوبارہ کرائی جائے اور پوری کتاب پر بھرپور نظرِثانی کرکے اور ان مکررات و زوائد کو حذف کرکے جو دراصل تقریر کا خاصہ ہوتے ہیں' اس کے حسنِ معنوی کو بھی دوبالا کیا جائے۔ الحمدللہ کہ کتاب کے اس ساتویں ایڈیشن میں یہ دونوں مقصود حاصل کرلئے گئے ہیں۔ گو اس کام میں غیر معمولی تاخیر ہوئی ہے' تاہم ع دیر آید درست آید! —— ہمارے رفیق کار حافظ خالد محمود خضر نے محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی رہنمائی اور ان کے مشوروں کی روشنی میں بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس کتاب پر نظرثانی کرکے مناسب اصلاح کردی ہے۔ اور کمپیوٹر کتابت سے اس کے حسنِ ظاہری میں بھی خاطرخواہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ آمین!

از

ناظم نشرو اشاعت

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۴ر جنوری ۱۹۹۳ء

مطالباتِ دین

عبادتِ ربّ
سورۃُ البقرہ کی آیت ۲۱ کی روشنی میں
ایک مسلمان سے دین کا اوّلین تقاضا
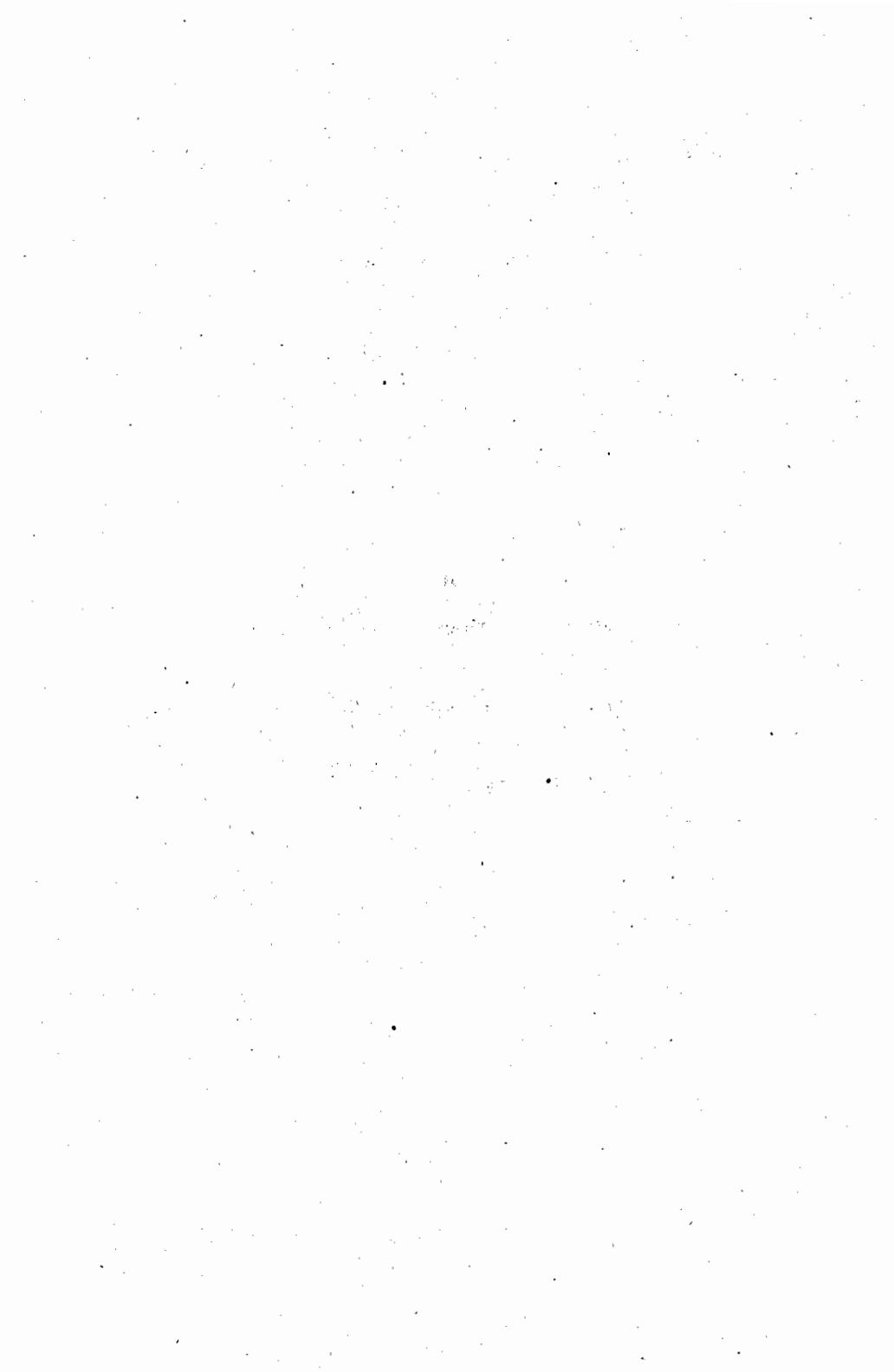
نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسولہ الکریم
اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم - بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ○
یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ
لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ: ۲۱)

آیت کا محل و مقام

اس آیۂ مبارکہ پر غور و تدبّر سے پہلے ضروری ہے کہ اس مقام کو سمجھ لیا جائے جس میں یہ وارد ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں سب سے پہلی سورت' سورۃ الفاتحہ ہے اور اس کا مقام بلاشبہ تقریباً وہی ہے جو کسی کتاب میں دیباچے یا مقدّمے کا ہوتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ دعا تلقین فرمائی ہے کہ:

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○

"پروردگار! ہمیں سیدھی راہ پر چلا!"

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○

"اپنے ان بندوں کی راہ پر جن پر تیرا انعام ہوا۔ جن پر نہ تو تیرا غضب نازل ہوا' اور نہ وہ گمراہ ہوئے!"

اس دعا پر سورۃ الفاتحہ کا اختتام ہوتا ہے اور اس کے بعد پورا قرآن مجید گویا کہ اس دعا کا جواب ہے کہ یہ قرآن مجید ہی دراصل وہ صراطِ مستقیم اور سواءُ السّبیل ہے جس کی ایک بندۂ مومن کو احتیاج ہے۔ یہی ان لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ کا انعام و اکرام ہوا۔ جو نہ گمراہ ہوئے اور نہ ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دعا کا مفصل جواب پورے قرآن حکیم میں بالعموم اور پہلی چار طویل مدنی سورتوں (البقرہ' آلِ عمران' النساء' المائدہ) میں بالخصوص پھیلا ہوا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ البقرہ شروع ہوتی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے پہلے دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔ ایک وہ جو قرآن مجید سے ہدایت حاصل کریں گے۔ ان کے ذکر میں وہ شرائط بیان کر دی گئی ہیں جو قرآن' مجید سے

صحیح استفادے کے لئے ضروری اور لازمی ہیں۔ دوسرے وہ جو کفر پر ضد کے ساتھ اڑ چکے ہیں اور ان کے لئے قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ اب ان میں طلبِ ہدایت ہی سرے سے باقی نہیں رہی ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا: "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ"—— کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کی قوتِ سماعت پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ پھر دوسرے رکوع میں انسانوں کی تیسری قسم کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے' جو ان پہلی دو قسموں کے بین بین ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو اقرار کرتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے' جبکہ فی الواقع وہ مومن نہیں ہیں۔ دوسرا رکوع پورے کا پورا انہی لوگوں سے متعلق تفصیلات' ان کی کیفیات اور ان کے اوصاف پر مشتمل ہے۔

قرآن کی اصل دعوت

اس کے بعد تیسرے رکوع میں قرآن مجید بنی نوعِ انسان کے سامنے اپنی اصل دعوت پیش کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

"اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان کو جو تم سے پہلے تھے' تاکہ تم بچ سکو۔"

یہ گویا کہ قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ ہے جو اس ایک آیت میں ایک جملے کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ گویا اگر یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ قرآن مجید کی اصل دعوت کیا ہے' اس کا پیغام کیا ہے' اور وہ انسانوں کو کس بات کی طرف بلاتا ہے تو اس کے لئے یہ ایک جملہ ہی کفایت کرے گا' بشرطیکہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس آیت مبارکہ کے ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کو وضاحت سے بیان کیا جائے۔

اس آیت مبارکہ کا آغاز "يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ" کے الفاظ سے ہوتا ہے اور "يٰٓاَيُّهَا" کلمہ

ندا ہے' جو پکارنے کے لئے اور دعوت دینے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی اے لوگو! اے بنی نوع انسان! اس اندازِ دعوت و تخاطب سے ایک بات تو یہ واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید ایک دعوت کا حامل ہے' اس کے پاس ایک پیغام ہے' یہ ایک پکار کا امین ہے۔ یہ مجرد "Dogma" اور محض بے بنیاد اور بے دلیل عقائد پر مشتمل کوئی کتاب نہیں ہے کہ اس کی طرف لوگوں کو بلایا نہ جائے اور انہیں دعوتِ عمل نہ دی جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ کسی ایک قوم' طبقے' نسل' قبیلے یا رنگ کے انسانوں یا کسی ایک ملک کے رہنے والوں کو نہیں پکارتا بلکہ رنگ و نسل اور قوم و وطن کے امتیاز کے بغیر پوری نوعِ انسانی کو پکارتا ہے۔ اس کی دعوت زمان و مکان سے بالکل آزاد ہے اور تاقیامِ قیامت پورا عالمِ انسان اس کا مخاطب ہے۔

دعوت میں آفاقیت

یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جتنے بھی نبی اور رسول آئے ہیں ان کی دعوت پورے عالمِ انسانی کے لئے نہیں تھی' بلکہ اپنی اپنی قوم کے لئے تھی۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی قوم کو خطاب کر کے پکارا اور اسے دعوت پیش کی۔ قرآن مجید میں حضرت نوحؑ حضرت ہودؑ حضرت صالحؑ اور دوسرے انبیاء و رسل (علیہم السلام) کا نام بنام ذکر کر کے ان کی دعوت کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں' جن میں کلمہ خطاب "یٰقَوْمِ" ہے' یعنی "اے میری قوم کے لوگو!" حتیٰ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی' جن کی نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متصلاً قبل تھی' اپنی دعوت صرف بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی۔ اس بات کی شہادت محرف شدہ اناجیل میں بھی مذکور ہے اور قرآن حکیم میں بھی آپؑ کے بارے میں "وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" کے صریح الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ انجیل میں آپؑ کے یہ الفاظ ملتے ہیں: "میں اسرائیل کے گھرانے کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں"۔ گویا آپؑ کی دعوت کے اصل مخاطب بنی اسرائیل تھے' پوری نوعِ انسانی نہیں تھی۔ بعد میں قلبِ ماہیت ہوئی اور عیسائیت نے ایک تبلیغی مذہب کی حیثیت اختیار کر لی' ورنہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت اصلاً صرف بنی اسرائیل ہی کے لئے تھی۔ لیکن نبی آخر الزمان حضرت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے لئے یہاں "یٰقَوْمِ" کے بجائے "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اے لوگو! اے بنی نوعِ انسان!! یہ دعوت علی الاطلاق پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔

مذاہب کی دنیا سے علیحدہ ہٹ کر بھی سوچا جائے تو اس وقت دنیا میں مختلف نظریات کی حامل بے شمار دعوتیں موجود ہیں' لیکن ان میں سے کوئی ایک دعوت بھی ایسی نہیں ہے جس میں پوری نوعِ انسانی کو علی الاطلاق اور بحیثیت ایک اکائی بلایا اور پکارا جاتا ہو۔ موجودہ صدی میں زیادہ سے زیادہ بڑی دعوت جو قومی و جغرافیائی سطح سے کچھ بلند ہوئی' وہ اشتراکیت کی دعوت ہے' لیکن اس میں بھی پکار یہ ہے کہ "دنیا بھر کے مزدورو اور کسانو' متحد ہو جاؤ!" یعنی یہ دعوت دنیا بھر کے انسانوں کے لئے نہیں ہے' بلکہ صرف کسانوں اور محنت کشوں پر مشتمل ایک مخصوص طبقے کے لئے ہے۔ اور اس طرح سوسائٹی کو طبقات میں تقسیم کر کے ایک خاص طبقہ کی حمایت کا اعلان کیا جاتا ہے اور دوسرے طبقوں کو نہ صرف ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے' بلکہ قابلِ نفرت گردانا جاتا ہے۔ دنیا میں وہ واحد دعوت جو پوری نوع انسانی کو بغیر کسی طبقاتی فرق و تفاوت کے مخاطب کرتی ہے' اسلام اور قرآن کی دعوت ہے۔ یہی ایک ایسی دعوت ہے جس کا خطاب ہر انسان سے ہے۔ امیر اور غریب یکساں طور پر اس کے مخاطب ہیں۔ وہ خواہ کسی ملک کے رہنے والے ہوں' کوئی سی زبان بولتے ہوں' کسی بھی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے حامل ہوں اور کسی دَور سے بھی تعلق رکھتے ہوں' ان سب کے لئے قرآن مجید میں پیغام ہے: "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ!" یعنی اس کا مخاطب کوئی خاص طبقہ' گروہ' قوم یا نسل نہیں ہے' بلکہ پوری انسانی برادری اس کی مخاطب ہے۔ لہٰذا صرف قرآن مجید کی دعوت ہی عالمگیر اور آفاقی حیثیت کی حامل دعوت ہے!

قرآن کی اصل دعوت ۔۔ "عبادتِ ربّ"

اب اگلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ یہ دعوت اصل میں ہے کیا؟ قرآن مجید کا پیغام کیا ہے اور یہ کس طرف پکارتا اور کس کام کے لئے بلاتا ہے۔ اس بات کو یہاں ایک لفظ "اُعْبُدُوْا" میں بیان فرما دیا گیا۔ یعنی عبادت کرو! بندگی اختیار کرو! غلامی اور اطاعت اختیار کرو!

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○

"اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں بھی پیدا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے --- تاکہ تم بچ سکو!"

معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی دعوت کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہے "عبادتِ رب" یا "بندگیٔ رب"۔ گویا قرآن مجید کی پوری دعوت کا خلاصہ یہی ہے کہ: "اللہ کی بندگی اختیار کرو!" سورۂ ہود کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ○ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ط اِنَّنِىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ○

"یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئی ہیں (خوب جانچ لی گئی ہیں) پھر ان ہی کی تفصیل و شرح کی گئی ہے ایک حکمت والی اور خبردار ہستی کی طرف سے۔ (یہ کتاب جو پیغام لے کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یقیناً میں تمہارے لئے اس ہستی کی طرف سے نذیر اور بشیر بن کر آیا ہوں۔"

یعنی اگر اس دعوت سے اعراض کرو گے' اس کی خلاف ورزی کرو گے' اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت اور بندگی اختیار کرو گے اور عبادت اور بندگی میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کر لو گے تو میں تمہیں اللہ کے عذاب سے خبردار کرنے آیا ہوں' اس کی پکڑ سے اور اس کے جزا و سزا کے نظام سے ڈرانے آیا ہوں۔ اور اگر اسی کی عبادت کو اختیار کرو گے' اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کر لو گے اور اس کی غلامی کو اپنا شعار و وطیرہ بنا لو گے تو میں تم کو خوش خبری سنانے آیا ہوں کہ تم اس کے انعام و اکرام سے سرفراز ہو گے اور جنت تمہارا ہمیشہ کے لئے مستقر بن جائے گی۔

تمام انبیاءؑ و رسلؑ کی مشترک دعوت

اس مقام پر اصولی بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) مبعوث فرمائے وہ یہی "عبادتِ رب" کی دعوت لے کر آئے تھے۔ یہ

بات دو اور دو چار کی طرح بالکل بدیہی ہے کہ تمام انبیاءؑ و رسلؑ اسی دعوتِ بندگیٔ ربّ کے داعی تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کی تخلیق کی غرض و غایت ہی اپنی بندگی اور عبادت مقرر فرمائی ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر فرمایا کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ○ ("میں نے جنوں اور انسانوں کی تخلیق ہی اس لئے کی ہے کہ وہ میری عبادت کریں")۔ لہٰذا یہ لازم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ' اس کے پیغامبر' اس کے نمائندے' اس کے نبی اور رسول' نوعِ انسانی کو اپنی تخلیق کی غرض و غایت کو پورا کرنے کی دعوت دیں۔ انہیں بتائیں کہ اگر انہوں نے اپنی تخلیق کا مقصد پورا نہ کیا' اس کا حق ادا نہ کیا' اپنے خالق اور ربّ کی بندگی اختیار نہ کی' اور اس کو مُطاعِ مطلق تسلیم کر کے اپنی پوری زندگی اس کی اطاعت میں نہ دے دی تو وہ دنیا میں بھی خائب و خاسر اور ناکام رہیں گے' اس کے غضب کے مستوجب قرار پائیں گے اور آخرت میں بھی ان کے حصے میں خسران و نامرادی کے سوا کچھ نہ آئے گا اور وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے آگ کے عذاب کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

سورۃ الاعراف' سورۂ ہود' سورۂ یونس' سورۃ الانبیاء' سورۃ الشعراء اور متعدد مکّی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیاءؑ و رسلؑ کا نام بنام ذکر فرمایا ہے اور صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ وہ "عبادتِ ربّ" کی دعوت لے کر اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں تو ہر رسول کی دعوت کی ابتداء کے لئے یہی کلمات نقل کئے گئے ہیں: "يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" کہ اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو' کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی اِلٰہ اور کوئی معبود نہیں ہے! دیگر مقامات پر انبیاءؑ و رسلؑ کی دعوت کے جو بنیادی نکات بیان ہوئے ہیں وہ یہ ہیں: اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ (العنکبوت) "اللہ کی عبادت کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو!" ـــــ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ○ (نوح) "کہ اللہ کی بندگی کرو' اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!" چنانچہ اللہ کی بندگی اختیار کرنے اور نبی کی اطاعت کا قلادہ گردن میں ڈالنے کی دعوت ہی ہر نبی کی مرکزی دعوت رہی ہے۔

"عبادت" - قرآن حکیم کی ایک بنیادی اصطلاح

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ "عبادتِ رب" قرآن مجید کی بڑی ہی بنیادی اور مرکزی اصطلاح ہے اور پورے قرآن حکیم کی دعوت کا خلاصہ اسی ایک لفظ "عبادت" میں پنہاں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی دعوت کا فہم اسی لفظ "عبادت" کے صحیح فہم پر منحصر ہے اور اسی سے تمام انبیاءؑ و رسلؑ کی اس متفقہ دعوت کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے جس کی طرف وہ اپنے اپنے ادوار میں اپنی قوموں کو بلاتے رہے اور جسے پورے عالم انسانی کے لئے خاتم النبیین والمرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر مبعوث ہوئے۔ عبادتِ رب کی اہمیت کو سمجھنے اور اس کے مفہوم کی وضاحت کے لئے قرآن حکیم کے متعدد مقامات سے مدد لی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ البینہ کی آیت ۵ کا مطالعہ فرمایئے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنی اطاعت کو صرف اس کے لئے خالص کر کے' بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور یہی (طرز عمل) نہایت صحیح و درست دین (نظام زندگی) ہے۔"

اس آیۂ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم کے ضمن میں میں چاہتا ہوں کہ آپ دو باتیں نوٹ فرما لیں۔ پہلی بات تو اس سورۂ مبارکہ کا نام ہے جس میں یہ آیت وارد ہوئی۔ اور دوسری بات وہ سلسلۂ کلام ہے' جس میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سورۂ مبارکہ کا نام "البینہ" ہے' جس کے معنی ہیں "روشن اور واضح دلیل"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سورۂ مبارکہ کے مضامین روزِ روشن کی طرح عیاں اور سورج کی طرح تابناک ہیں۔ جس طرح "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کے مصداق سورج کے وجود کے لئے کسی خارجی دلیل کی حاجت نہیں' اسی طرح اس سورۃ کے مضامین خود اپنے مطالب و مفاہیم ادا کرنے کے لئے کافی و شافی ہیں۔ پچھلی آیات سے اس آیۂ مبارکہ کا ربط و تعلق یہ ہے کہ اہلِ کتاب

اور مشرکین اپنے کفر و ضلالت میں اتنے آگے نکل گئے تھے کہ اب ان کا خود اپنے محرف صحیفوں سے اور خود اپنی عقل سے راہِ ہدایت پا لینا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رسولؐ ان کے پاس دلیلِ روشن اور پاکیزہ صحیفے کے ساتھ بھیجا جائے، جو ان کے سامنے پچھلی تمام کُتبِ صادقہ کی اصل دعوت کو از سرِنو پیش کرے، انہیں آیاتِ الٰہی کی تلاوت کر کے سنائے اور کفر و شرک کی ہر صورت کو غلط اور خلافِ حق ہونا ان کو سمجھائے۔ سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں اس اسلوب بیان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت بیان فرمائی گئی۔ پھر اس بات کو کھولا گیا کہ ان اہلِ کتاب کی تفرقہ بازی اس لئے نہیں تھی کہ ان تک صحیح علم نہیں پہنچا تھا، بلکہ دلیلِ روشن آ جانے کے بعد ان کا یہ تفرقہ، ان کا حق سے اعراض اور ان کی بداعمالیاں محض ہوائے نفس کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کا ہر نبی اور رسول عبادتِ ربّ کی دعوت لے کر آیا تھا اور آیا کرتا ہے۔ اور انہیں اس کے سوا اور کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، یکسو ہو کر اپنی اطاعت کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور یہی دراصل دینِ قیم ہے!

غور طلب بات یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا علیحدہ حکم ہے اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا علیحدہ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان فرض عبادات سے علیحدہ ایک "عبادت" انسان سے مطلوب ہے۔ اس عبادت کو "لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ" کے الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ عبادت اس رویّہ اور طرزِ عمل کا نام ہے کہ انسان یکسو ہو کر اپنی پوری زندگی کو مخلصانہ طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دے۔ اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ اور ہر زاویہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تابع ہو۔ نظامِ اخلاق، نظامِ معیشت، نظامِ معاشرت، نظامِ سیاست، نظامِ عدل، نظامِ صلح و جنگ اور نظامِ حکومت، غرضیکہ پورا نظامِ زندگی اس ضابطہ اور اس ہدایت کے تحت استوار ہو جو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کے توسّط سے بنی نوعِ انسان کی فلاحِ دنیوی اور نجاتِ اخروی کے لئے عطا فرماتا ہے۔ البتہ جہاں تک اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور دوسری فرض عبادات کا اس عبادتِ ربّ سے تعلق کا معاملہ ہے وہ ان شاء اللہ میں بعد میں بیان کروں گا۔

"عبادت" کا لغوی مفہوم

لغوی اعتبار سے لفظ "عبادت" کسی کے سامنے مطیع و منقاد ہو جانے کے لئے آتا ہے۔ اس کا مفہوم کسی کے سامنے جھک جانا' پست ہو جانا اور بالکل بچھ جانا ہے۔ اسی لئے عربی میں "اَلطَّرِیْقُ الْمُعَبَّدُ" اس راستے کو کہتے ہیں جو مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے خوب پامال ہو کر بالکل ہموار ہوگیا ہو اور اس میں کوئی اونچائی نیچائی نہ رہی ہو۔ اسی طرح اگر کسی جانور کو خوب سدھا لیا جائے اور اس کی تربیت اس طور سے ہو جائے کہ وہ اپنے مالک کا ہر حکم ماننے لگے' محض اشارے یا لگام کی ذرا سی حرکت سے وہ سمجھ لے کہ میرا مالک کیا چاہتا ہے' مجھے کدھر مڑنا چاہئے' مجھے اپنی رفتار تیز کرنی چاہئے یا ہلکی رکھنی چاہئے تو اس کے لئے بھی عربی میں یہی لفظ "مُعَبَّد" مستعمل ہے۔ چنانچہ "اَلْبَعِیْرُ الْمُعَبَّدُ" اس اونٹ کو کہتے ہیں جسے خوب سدھا لیا گیا ہو اور جو پورے طور پر اپنے مالک کا مطیع ہو کر اس کے اشاروں پر حرکت کرنے لگا ہو۔ ابوحیان اندلسی نے "عبادت" کے ان تمام مفاہیم کا استقصاء کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: "اَلْعِبَادَةُ التَّذَلُّلُ۔ قَالَہُ الْجَمْہُوْرُ"۔ یعنی اس پر تقریباً اجماع ہے کہ عبادت کا اصل مفہوم "تذلّل" یعنی کسی کے سامنے پست ہو جانا' کسی کے سامنے جھک جانا' یا کسی کے سامنے بچھ جانا ہے۔ ہماری اردو زبان کے لحاظ سے "بچھ جانا" اصل مفہوم سے قریب ترین ہوگا۔ چنانچہ کسی کا مطیع فرمان ہو جانا اور خود کو اس کے سامنے بچھا دینا اصل میں عبادت ہے۔

بعض اوقات کسی کی اطاعت مجبوری کے تحت اور اپنی مرضی کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی اطاعت پر بھی اس لفظ عبادت کا اطلاق ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید نے مصر میں بنی اسرائیل کی محکومی اور اطاعت کی جو کیفیت بیان کی ہے کہ فرعون اور قبطیوں نے ان کو اپنا غلام بنا رکھا تھا' وہ ان پر حکمران ہوگئے تھے اور ان کو اپنا مملوک سمجھنے لگے تھے' اس مفہوم کی تعبیر کے لئے یہی لفظ "عبادت" استعمال کیا ہے۔ سورۃ الشعراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل ہوا ہے جو انہوں نے فرعون سے مخاطب ہو کر کہا تھا: "اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام اور محکوم بنا لیا ہے' اپنا مطیع کر لیا ہے' تو خود کو ان کا مالک سمجھ بیٹھا ہے! اور پھر یہی لفظ ایک موقع پر خود فرعون نے بھی استعمال کیا۔ جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) نے فرعون کے

دربار میں پہنچ کر اس کو بندگیٔ رب کی دعوت دی تو اس نے بڑے طنز اور استحقار کے انداز میں کہا تھا کہ یہ لوگ ہمیں دعوت دینے، تبلیغ کرنے اور نصیحت کرنے چلے آئے ہیں، درآنحالیکہ: "وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ" اور یہ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو ہماری محکوم قوم ہے، جو ہماری مطیع اور غلام ہے، جس پر ہمیں کُلی اختیار حاصل ہے۔ لہٰذا لغوی اعتبار سے عبادت کا لفظ مجرد اطاعت کے لئے بھی آتا ہے، چاہے اس میں اطاعت کرنے والے کی اپنی مرضی اور خواہش کا دخل نہ ہو۔

"عبادت" کا اصطلاحی مفہوم

یہی لفظ "عبادت" جب اپنی لغوی اصل سے اٹھ کر ہمارے دین کی ایک اصطلاح بنتا ہے تو "اطاعت" کے ساتھ ساتھ اس میں ایک دوسرا جزو لازماً شامل ہو جاتا ہے اور وہ ہے "محبت اور شوق کا جذبہ"۔ لہٰذا عبادت کا حقیقی مفہوم یہ ہوگا کہ شوق اور محبت کے جذبے کے ساتھ کسی کے سامنے اپنے آپ کو بچھا دینا۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس لفظ کی تعریف اس طرح سے کی ہے:

"لفظُ العبودیّۃ یتضمن کمال الذلّ و کمال الحبّ"

یعنی اس لفظ عبودیت میں دو چیزیں لازمی طور پر شامل ہیں۔ ایک طرف تو "کمالِ ذُلّ" ہو ــــ انسان نے اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ کے سامنے بچھا دیا ہو، گرا دیا ہو، پست کر دیا ہو، اور وہ خود اپنی مرضی سے اللہ کی مرضی کے حق میں دست بردار ہو گیا ہو ــــ اور دوسری طرف اس کا جزوِ لازم "کمالِ حُبّ" ہے، کہ اللہ کے سامنے یہ جھکنا اور یہ اطاعت و تسلیم کمالِ محبت و شوق اور دل کی پوری آمادگی اور رغبت کے ساتھ ہو۔ اگر کوئی مجبور ہو کر اطاعت کر رہا ہو تو یہ اصل میں روحِ عبادت سے خالی ہوگی۔ امام ابن قیمؒ نے اسے ان الفاظ میں مزید واضح کیا ہے:

"العبادۃ تجمع اصلین : غایۃ الحبّ مع غایۃ الذلّ و الخضوع"

یعنی عبادت میں دو چیزیں لازماً شامل ہوں گی، اور وہ یہ کہ ایک طرف انتہائی درجے کی محبت، شوق، رغبت اور دل کی آمادگی ہو، اور دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ غایت درجے کا تذلّل اور خضوع بھی موجود ہو۔ چنانچہ ان کے نزدیک کمالِ محبت و شوق اور

رغبت کے ساتھ اللہ کے آگے خود کو بچھا دینا اور پست کر دینا ہی اصل روحِ عبادت ہے۔

عبادت کا یہ اصطلاحی مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب قرآن مجید کی دعوتِ عبادت پر دوبارہ توجہ مرتکز کیجئے۔ "یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ" کا مفہوم یہ ہو گا کہ اے انسانو' اے بنی نوعِ آدم! جھک جاؤ' پست ہو جاؤ' اپنے آپ کو بچھا دو——کمالِ محبت اور کمالِ شوق و رغبت کے ساتھ—— اس ہستی کے سامنے جو تمہارا ربّ ہے۔ اور وہی تمہارا خالق اور پیدا کرنے والا بھی ہے۔ یعنی تمہارا پالنے والا وہی ہے جو تمہارا موجد ہے۔ جس نے تم کو وجود بخشا ہے' وہی اس وجود کی تمام ضروریات فراہم کرنے والا اور اس کی کفالت کرنے والا ہے۔

"عبادت" کا محدود تصوّر

عبادت کے اس حقیقی مفہوم کو ذہن میں رکھ کر سوچئے کہ ہمارے ہاں اس لفظِ عبادت کا حلیہ کس طرح بگڑا ہے۔ ہمارے ہاں دینی تصوّرات جس طرح محدود اور بعض حلقوں میں جس قدر مسخ ہوئے ہیں' اس کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر یہ ہے کہ ہم نے "عبادت" کو صرف چند اعمال اور مراسمِ عبودیت کے ساتھ مخصوص کر لیا ہے اور بس ان ہی کی ادائیگی پر عبادت کو منحصر سمجھ لیا ہے' جبکہ بقیہ زندگی اس سے بالکل خالی ہے۔ ہمارے عوام الناس کے ذہنوں میں عبادت کا یہ تصوّر صدیوں کے انحطاط کے بعد راسخ ہو گیا ہے کہ بس نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ہی عبادت کے زمرے میں آتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سب عبادات ہیں' لیکن جب عبادت کو انہی میں منحصر کر لیا جائے گا اور یہ سمجھ لیا جائے گا کہ بس ان کو ادا کرنے سے عبادت کا حق ادا ہو گیا تو تصور دین محدود (Limited) ہی نہیں' مسخ (Perverted) ہو جائے گا۔ اور یہ تصور اس وقت تک صحیح اور درست نہیں ہو گا جب تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عبادت پوری زندگی میں خدا کے سامنے بچھ جانے کا نام ہے۔ عبادت اس طرزِ عمل کا نام ہے کہ کمالِ محبت و شوق اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ زندگی کے ہر معاملے اور ہر گوشے کو اللہ کے حکم کا مطیع بنا دینا اور اپنی آزادی' اپنی خود مختاری' اپنی مرضی' اپنی چاہت' اور اپنی پسند اور ناپسند کو اللہ کی مرضی اور رضا کا تابع بنا دینا' زندگی کے تمام افعال و اعمال میں "سرِ تسلیم خم ہے......" کا رویّہ

اختیار کرنا اور پوری زندگی کا اس رُخ پر ڈھل جانا ہی عبادت ہے۔ عبادت نماز' روزہ' حج و زکوٰۃ میں محدود و منحصر نہیں ہے' بلکہ جیسا کہ میں بعد میں عرض کروں گا' یہ وہ اعمال ہیں جو پوری زندگی کو خدا کی بندگی اور غلامی میں دینے کے لئے انسان کو تیار کرتے ہیں اور حقیقی عبادت کی ادائیگی میں اس کے ممد و معاون بنتے ہیں۔ ان کے ذریعے انسان میں وہ قوتیں اور صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اس روش کو اختیار کر سکے جس کا نام "عبادت" ہے۔

ایک وسیع تر لیکن ناقص تصورِ عبادت

خوش قسمتی سے اس دور میں عبادت کا ایک وسیع تر تصور پیدا ہوا ہے اور بہت سے اہلِ قلم حضرات کی کاوشوں اور کوششوں کے نتیجے میں اب یہ بات پڑھے لکھے طبقے کی اچھی خاصی تعداد کے سامنے واضح ہو چکی ہے کہ عبادت پوری زندگی میں کامل اطاعت کا نام ہے' اور پوری زندگی میں خدا کے حکم کو ماننا اور زندگی کے تمام گوشوں میں قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنا عبادت کا تقاضا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس طبقہ کے تصورِ عبادت کے اندر بھی ایک محدودیت موجود ہے اور وہ یہ کہ ان کے ہاں عبادت کے ایک جزو یعنی کامل اطاعت پر تو پورا زور (Emphasis) موجود ہے' لیکن اس کی روحِ حقیقی یعنی کمالِ شوق' اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذاتی محبت کا تعلق' کمالِ رغبت اور دل کی پوری آمادگی جیسی ارفع و اعلیٰ منازل نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت کی اس روحِ حقیقی کے بغیر محض اطاعت کو اگر پوری زندگی پر بھی پھیلا دیا گیا ہو تو بھی عبادت کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اس کے لئے کامل اطاعت کے ساتھ ساتھ اللہ کے ساتھ انس' دلی لگاؤ اور شوق و رغبت بھی لازمی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام   میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب![1]

---

[1] عبادت کے اس مفہوم کو ماہر القادری مرحوم نے ان الفاظ میں شعر کا جامہ پہنایا ہے ۔

جو سجدے میں دل بھی جھکے گا نہ ماہر
وہ کچھ اور شے ہے' عبادت نہ ہوگی!

(مرتب)

عبادت کی روحِ حقیقی : محبتِ الٰہی

عبادت کی روحِ حقیقی محبتِ خداوندی کو قرآن حکیم میں بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اسے ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ

"اور جو لوگ ایمان لائے' وہ سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتے ہیں"

اس آیت کے پہلے حصے میں فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ

"اور لوگوں میں بہت سے تو ایسے ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو اس کا مدِمقابل بنا لیا ہے۔ اور وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہئے۔"

"يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ" میں کاف (ک) حرف تشبیہ ہے۔ اسے ذہن میں رکھ کر اگر ہم اپنی اصل کیفیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ تو اس سے بھی بدتر ہے' کیونکہ ہم نے خدا کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں اور نظریات و خیالات کو خدا جیسا ہی نہیں بلکہ خدا سے بھی زیادہ محبوب بنا لیا ہے' ہم نے خدا کی محبت کو مؤخر کر دیا ہے اور دنیا کی محبت عملی طور پر ہمارے لئے مقدم ہو گئی ہے۔ ہم نے علائقِ دنیوی کی محبت کو اللہ کی محبت پر غالب کر دیا ہے۔ ہماری کیفیت تو وہ ہے جو سورۃ التوبہ کی ایک آیت ۲۴ میں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دینے کی وعید سنائی ہے۔ آیہ مبارکہ کے الفاظ ہیں:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

"(اے نبیؐ! ان سے صاف صاف) کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے ماں باپ' اپنے بیٹے' اپنے بھائی' اپنی بیویاں' اپنے رشتہ دار' اپنے وہ مال جو تم نے (بڑی محنتوں سے) جمع کئے ہیں' اپنے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو

خدشہ ہے اور اپنے وہ مکان جو تمہیں بہت پسند ہیں' اللہ ' اس کے رسولؐ
اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر منتظر رہو ' یہاں
تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنادے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

تو اس آیۂ مبارکہ میں فی الواقع ہمارا نقشہ اور ہماری تصویر موجود ہے۔ سورۃ الانبیاء میں قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا گیا: "فِیْهِ ذِکْرُکُمْ" کہ اس قرآن میں تمہارا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ ہر شخص قرآن کے اس ابدی و دائمی آئینہ میں اپنی سیرت کے خدوخال کو نمایاں طور پر دیکھ سکتا ہے۔ "فِیْهِ ذِکْرُکُمْ" کے الفاظ میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ ہماری تمام صلاحیتوں اور ہماری ساری دوڑ دھوپ کی نقشہ کشی اس کتابِ مبین میں کر دی گئی ہے۔ تو اصلاً ہمارا حال یہ ہے جو اس آیۂ مبارکہ میں بیان کیا گیا۔ حالانکہ اہلِ ایمان کا حال تو وہ ہونا چاہئے جو سورۃ البقرہ کی اس آیت میں بیان ہوا جس کا حوالہ میں نے ابھی دیا ہے کہ: "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" یعنی جو لوگ وا قعتہً ایمان سے بہرہ ور ہیں' جنہیں ایمان سے حصہ مل گیا ہے' جنہیں ایمان کی حلاوت حاصل ہوگئی ہے' ان کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں انتہائی شدید اور سخت ہیں۔ ان کی زندگی میں اللہ کی محبت ہر چیز کی محبت پر غالب آگئی ہے۔ تمام علائقِ دنیوی کی محبت نیچے ہے اور اللہ کی محبت اس پر غالب ہے۔ تو اللہ کی محبت ایمان کے لوازم میں سے ہے۔ بلکہ صرف اللہ ہی کی نہیں' اللہ کے رسولؐ کی محبت بھی جب تک تمام علائقِ دنیوی پر غالب نہ ہو جائے تب تک ایمان صحیح نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُم حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اجمعین

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسے اپنے
والدین سے ' اپنی اولاد سے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ
ہوجاؤں۔"

یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں محبتِ خداوندی اور محبتِ رسولؐ کا مقام و مرتبہ اور "عبادتِ ربّ" کا حقیقی مفہوم آپ پر اچھی طرح واضح ہوگیا ہوگا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ "عبادتِ ربّ" کے حقیقی تصوّر کو عام کیا جائے۔ جن حضرات کے ذہنوں میں یہ تصوّر واضح ہو جائے وہ اسے مزید آگے پھیلائیں اور عوام الناس کو آگاہ کریں کہ عبادت سے محض نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ مراد لے لینا اور باقی زندگی کو اس سے خارج سمجھنا عبادت کا بڑا ہی غلط تصوّر ہے۔ عبادت تو اصلاً یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر پوری زندگی اللہ کی اطاعت میں بسر ہو اور زندگی کا کوئی گوشہ اس سے آزاد نہ رہے۔ نہ صرف یہ کہ ہماری گھر کی زندگی اور بازار کی زندگی اللہ کی کامل اطاعت کا نمونہ نظر آئے' بلکہ قومی اور ریاستی سطح کے تمام ادارے اور حکومت کے تمام شعبے جب تک قانونِ خداوندی کے پابند نہ ہو جائیں' اس وقت تک عبادت کا حقیقی تقاضا ادا نہیں ہوتا اور "اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً" ("اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ") کے قرآنی حکم کی تعمیل نہیں ہوتی۔۔۔ اس کے بعد اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ مجرد اطاعت نہیں' بلکہ وہ اطاعت مطلوب ہے جو اپنے ساتھ محبت کی چاشنی لئے ہوئے ہو' جس کے اندر دل کی گھلاوٹ شامل ہو' جس میں خدا کے ساتھ ایک ذاتی تعلق اور ذاتی محبت کا رشتہ موجود ہو۔ انسان اگر مجبور ہو کر کسی کا مطیع ہو جائے یا اضطراری طور پر کسی کی محکومی قبول کر لے تو یہ صورت اطاعت تو کہلائے گی لیکن عبادت نہیں کہلائے گی۔ عبادت کا تقاضا اسی وقت پورا ہوگا جب اطاعت کے ساتھ انتہائی محبت' انتہائی شوق' انتہائی رغبت اور دل کی پوری آمادگی شامل ہوگی۔ اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہی اصل روحِ دین ہے' اور بدقسمتی سے اسی کی کمی ہے ان مساعی اور کوششوں میں جو ہمارے ملک میں یا چند دوسرے اسلامی ممالک میں دینِ اسلام کے احیاء اور اس کی نشأۃِ ثانیہ (RENAISSANCE) کے لئے ہو رہی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عصرِ حاضر میں ہمارے ہاں افکار و نظریات کی ایک تعمیرِ نو ہو رہی ہے' اور دینی تصوّرات کسی حد تک دوبارہ اپنی اصل حقیقت کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ ہم جب زوال پذیر ہوئے تو پستی کی انتہا کو پہنچے' یہاں تک کہ ہمارے دینی تصوّرات بھی مسخ ہوئے۔۔۔ لیکن رفتہ رفتہ تعمیرِ نو ہو رہی ہے اور بہرحال یہ بات انتہائی قابلِ تعریف اور قابلِ قدر ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بہت بڑی تعداد پر یہ بات واضح

ہو چکی ہے کہ عبادت کا اصل مفہوم پوری زندگی میں خدا کی اطاعت کا نام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اصل کام یعنی روحِ دین کی تجدید اور اس کا احیاء ابھی باقی ہے۔ روحِ دین اصل میں نام ہے اللہ کے ساتھ ایک ذاتی تعلق' ذاتی محبت اور ذاتی انس کا۔ جب تک دل میں اللہ کی ذات کا کامل یقین اور اس کے ساتھ قلبی محبت کا تعلق نہیں ہوتا' اور اس یقین اور محبت کے نتیجے میں اللہ کی ذات محبوب ترین نہیں ہو جاتی' اس وقت تک گویا اصل روحِ دین موجود نہیں ہے۔ گویا بس ایک ڈھانچہ ہے جو کھڑا ہو گیا ہے' جس کے اندر ابھی روح نہیں پھونکی گئی۔ اور اطاعت کُلی اسی وقت عبادت قرار پائے گی' جب اس کے اندر ذاتی محبت کا عنصر شامل ہو گا۔

محدود تصورِ عبادت کا افسوسناک نتیجہ

عبادت کا تصور محدود ہونے ہی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ روحِ دین نگاہوں سے اوجھل ہو گئی' نتیجۃً ساری توجہ ڈھانچے ہی پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اور اب اس ڈھانچے کی اہمیت اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ ذرا ذرا سے فرق سے مستقل گروہ بندیاں ہو گئیں' مختلف مسلک بن گئے اور مستقل طور پر طے ہو گیا کہ یہ مسجد فلاں مسلک والوں کی ہے اور وہ فلاں مسلک والوں کی ہے۔ اور اختلاف یا فرق کیا ہے؟ مجرد یہ کہ کسی نے ہاتھ سینے پر باندھ لئے اور کسی نے ذرا نیچے' کسی نے آمین زور سے کہی اور کسی نے آہستہ' کسی نے رفع یدین کیا اور کسی نے نہیں کیا۔ حالانکہ دین میں ان سب کی اجازت موجود ہے' لیکن ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ان چیزوں کی بنیاد پر "من دیگرم تو دیگری" کی نوبت آ جاتی ہے۔ دین میں جن چیزوں کی حیثیت فروعی اور ثانوی' بلکہ اس سے بھی کمتر ہے' ان کو مقدم ترین سمجھ لیا گیا ہے۔ وجہ کیا ہے؟ یہی کہ اصل روح دین سامنے نہیں ہے۔ یہ تو یاد ہی نہیں کہ نماز کی اصل روح "اِستِحضَارُ اللّٰہِ فِی القَلبِ" یعنی دل میں اللہ کی یاد ہے' اس کی اصل جان خشوع اور خضوع یعنی عاجزی کے ساتھ اللہ کے سامنے جھک جانا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المؤمنون کے آغاز میں فرمایا گیا:

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۝

"بلاشبہ فلاح پا گئے وہ ایمان والے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے ہیں۔"

تو جب تک یہ خشوع موجود نہ ہو اس وقت تک نماز کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ؏ "عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات" کے مصداق اگر خدا کی محبتِ ذاتی قلب میں موجود نہ ہو تو سارے قوانین اور ضابطے محض ایک بے روح ڈھانچے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

عبادت کی ضد : استکبار

اب تک کی گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ عبادت اصل میں اللہ کے حضور تذلّل' عاجزی' جھک جانے' پست ہو جانے اور بچھ جانے کا نام ہے۔ اور اس کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ یہ زندگی کے کسی ایک گوشے میں محدود نہ ہو' بلکہ پوری زندگی پر محیط ہو۔ اس بات کو مزید اچھی طرح سمجھنے کے لئے سورۃ المؤمن کی اس آیتِ مبارکہ پر توجہ فرمایئے' جس میں "عبادت" کے متضاد کے طور پر لفظ "استکبار" وارد ہوا ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِىٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِىْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ۝

"اور تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھ کو پکارو ' میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ اور جو لوگ میری عبادت سے سرتابی اور سرکشی کرتے ہیں ' وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔"

معلوم ہوا کہ عبادت کا تقابل اور اس کی ضد (Antonym) استکبار' گھمنڈ' سرتابی' سرکشی' خود رائی اور اپنی مرضی پر چلنا ہے۔ اور عربی مقولہ **"تُعرَفُ الاشیاءُ باضدادھا"** کے مصداق عبادت کی حقیقت ان الفاظ کے ذریعے سمجھی جا سکتی ہے جو اس کی ضد کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی عبادت کی ضد یہ طرزِ عمل ہے کہ خدا کی مرضی کے مقابلے میں اپنی مرضی اور خدا کے حکم کے مقابلے میں اپنے نفس کے حکم کو ترجیح دی جائے۔ اس طرزِ عمل کو قرآن حکیم میں اپنی خواہشاتِ نفس کو اپنا معبود بنا لینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ الفرقان میں الفاظ وارد ہوئے ہیں:

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ

"کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟"

ایسا شخص گویا خدا کے بجائے اپنے نفس کی عبادت کر رہا ہے۔ خدا کے حکم کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی یا زمانے کے چلن اور معاشرے کے رسم و رواج کی تقلید کرنا درحقیقت عبادت کی ضد ہے۔

عبادت کی شرطِ لازم : اخلاص

عبادت کے ضمن میں قرآن حکیم میں یہ مضمون بھی صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ عبادت خالصۃً اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ چنانچہ سورۃ الزمر میں فرمایا:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ○ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ

"(اے نبیؐ) ہم نے حق کے ساتھ اس کتاب کو آپ کی طرف نازل کیا ہے'
پس آپ اللہ کی بندگی کیجئے' پوری اطاعت اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے!
یاد رکھو کہ خالص اطاعت بس اللہ ہی کے لئے ہے۔"

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر فرمایا:

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ○

"(اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ ساری اطاعت صرف اسی کے لئے خالص ہو جائے۔"

اور جیسا کہ میں پوری تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ دین کی رو سے اس اطاعت و فرمانبرداری میں شوق و محبت' جی کی رغبت اور دل کی پوری آمادگی شرطِ لازم ہے۔ تذلّل اور محبت دونوں مل کر عبادت کا تقاضا پورا کرتی ہیں۔ خدا کی اطاعت اس طرز کی اطاعت نہیں ہے کہ جیسے کسی جابر اور قاہر کی اطاعت طوعاً و کرہاً کی جاتی ہے' بلکہ یہ اطاعت انتہائی مشفق اور ودود ہستی کی اطاعت ہے۔ یہ الرحمٰن اور الرحیم کی اطاعت ہے' الرؤف اور الکریم کی اطاعت ہے' جو ہم سے بڑھ کر ہمارا خیر خواہ ہے۔ ہم اپنے آپ سے وہ محبت نہیں کر سکتے جو محبت وہ ہم سے کرتا ہے۔ ہم اپنے خیر اور شر کو نہیں جانتے اور اس میں تمیز نہیں کر سکتے' لیکن وہ اسے خوب جانتا اور پہچانتا ہے۔ ہم اپنی مصلحتوں سے آگاہ نہیں' لیکن وہ جانتا ہے کہ کس چیز اور کس کام میں ہماری مصلحت ہے۔ اس تصور

اور شعور کے ساتھ خدا کے سامنے بچھ جانا اور اپنی پوری زندگی کو بطیبِ خاطر اس کے قانون کی پابندی اور اطاعت میں دے دینا ـــــ یہ ہوگی وہ اطاعت جسے قرآن حکیم "عبادت" سے تعبیر کرتا ہے اور بنی نوع انسان کو جس کی دعوت دیتا ہے۔ اور جو انسان کی تخلیق کی غرض و غایت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق و ربوبیت

آیۂ مبارکہ "یَاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ....." میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں ـــــ ایک اس کا ربّ ہونا اور دوسرے اس کا خالق ہونا۔ در حقیقت یہ دو صفات ہی دعوتِ عبادتِ ربّ کی دلیلیں ہیں۔ یعنی وہی تمہارا خالق ' تمہیں وجود بخشنے والا ہے اور وہی تمہارا پروردگار اور پالنہار بھی ہے' لہٰذا صرف اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ انسان نہ تو آپ سے آپ پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی وہ خود اپنا خالق ہے۔ سورۃ الطور میں فرمایا گیا:

" اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۞" (کیا یہ یوں ہی آپ سے آپ پیدا ہو گئے یا انہوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا ہے؟) معلوم ہوا کہ ہم نے خود اپنے آپ کو تو پیدا نہیں کیا' بلکہ ہم مخلوق ہیں۔ پس جو خالق ہے اسی کو حق پہنچتا ہے کہ مخلوق پر اس کی مرضی چلے۔ یہی وہ بات ہے جو سورۃ الاعراف میں بایں الفاظ فرمائی گئی: " اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ " (خبردار ہو جاؤ ' وہی خالق ہے اور اسی کی حکومت و فرماں روائی ہے۔) ظاہر ہے کہ عقلِ سلیم اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے اسی کو حق پہنچتا ہے کہ اس کی بات مانی جائے' اس کا حکم مانا جائے' اس کی اطاعت کی جائے اور اسی کی مرضی چلے۔ آدمی خود اپنا خالق نہیں۔ یہاں تک کہ اس کے آباء و اجداد بھی اس کے خالق نہیں ' وہ بھی مخلوق تھے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ بلا سوچے سمجھے آباء و اجداد کے طریقے کی پیروی کی جائے اور وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (ہم نے اسی طریقہ پر اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے) کو دلیل بنا کر آباء پرستی شروع کر دی جائے' اس ہستی کی بندگی اور پرستش کرنی چاہئے جو خالق ہے۔ اس لئے آیت مبارکہ میں آگے اضافہ فرما دیا کہ: وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی جو تم سے پہلے تھے ان سب کا خالق

بھی وہی اللہ ہے جو تمہارا خالق ہے۔ ان کے طور طریقے اگر خدا کے حکم کے مطابق ہوں تب تو ان کا اتباع کیا جائے گا' لیکن اگر ان کی روش اس کے برعکس ہو تو ان کو کوئی استناد حاصل نہیں ۔ ان کا یہ حق ہرگز نہیں کہ ان کا اتباع کیا جائے۔ اس لئے کہ خالق سب کا اللہ ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ اللہ صرف تمہارا خالق ہی نہیں' بلکہ وہ تمہارا "رب" بھی ہے۔ وہ تمہاری تمام ضروریات پوری کر رہا ہے۔ تمہیں درجہ بدرجہ ترقی دیتے ہوئے اور ہر درجہ کی تمام ضروریات کا اہتمام کرتے ہوئے تمہیں تمہارے مقامِ کمال کی طرف لے جا رہا ہے۔ ماں کے دل میں مامتا' باپ کے دل میں شفقت اور عزیزوں کے دل میں محبت اسی کی پیدا کردہ ہے۔ موسموں کا تغیّر و تبدّل' بارش کا یہ نظام' زمین میں روئیدگی اور نشوونما کی قوت اور اس پر تمہارے لئے نفع رساں چوپایوں کا وجود' یہ نظامِ شمسی اور اس میں موجود جذبِ باہمی' غرضیکہ یہ پورا نظام اسی کی شانِ ربوبیت کا مظہر ہے۔ پس وہی تمہارا خالق ہے اور وہی تمہارا رب ہے۔

حکمتِ قرآنی کا ایک رمز

یہاں ایک بات نوٹ کرنے کی ہے کہ قرآن مجید بالعموم ایسے مقامات پر ربوبیت کو خلق پر مقدّم کرتا ہے' حالانکہ ترتیب کے اعتبار سے خلق ربوبیت پر مقدّم ہے۔ پہلے پیدا کرنا اور وجود بخشنا ہے' پھر اس کی ربوبیت و تربیت ہے۔ یہ دور اور مرحلہ خلق کے بعد شروع ہوتا ہے ۔ لیکن قرآن حکیم کا عام اسلوب یہی ہے کہ وہ ربوبیت کو خلق پر مقدّم کرتا ہے ۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں بھی ربوبیت کو تخلیق پر مقدّم کرتے ہوئے فرمایا گیا: **اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ** ○ "(اے نبیؐ!) پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔" اسی طرح یہاں بھی رب کے تصور کو مقدم کیا گیا اور تخلیق کے تصور کو مؤخر کیا گیا اور فرمایا کہ: "اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو پیدا کیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔" اس نکتے کو اچھی طرح سمجھیے کہ ربوبیت کو تخلیق پر کیوں مقدّم کیا گیا۔ انسان کے ذہن کا بچپن سے جو ارتقاء ہوتا ہے اگر ہم اس

کا جائزہ لیں اور اس کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن سب سے پہلے جس چیز کا اثر قبول کرتا ہے اور اس میں جو شعور و احساس سب سے پہلے اجاگر ہوتا ہے وہ ربوبیت ہی کا اثر اور احساس ہے ۔ ایک چھوٹے سے بچے کے ذہن کی کائنات بڑی ہی محدود ہوتی ہے' لیکن اپنے والدین کے بارے میں یہ تأثر (Impression) بہرحال اس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے کہ میری ہر ضرورت یہی فراہم کرتے ہیں۔ مجھے بھوک لگتی ہے تو غذا اور خوراک کا اہتمام کرتے ہیں' مجھے اگر کہیں سے کوئی خطرہ اور خوف لاحق ہو جائے تو میں لپک کر ان کی گود میں پناہ لے لیتا ہوں' لہٰذا یہ میرے محافظ بھی ہیں۔ گویا کہ ربوبیت کے تصور کے ساتھ جتنی چیزیں بھی وابستہ ہیں ' ان کا تأثر اس کے ذہن کی محدود کائنات میں موجود رہتا ہے اور والدین کے لئے ایک جذبۂ تشکر اس کے دل میں ابھرتا رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے سورہ بنی اسرائیل میں والدین کے لئے یہی لفظ ربوبیت استعمال کیا ہے۔ آیت ۲۳ میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہوئے ان کے لئے یہ دعا کرنے کی تلقین کی گئی ہے کہ: رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا "اے میرے پروردگار ان دونوں (والد اور والدہ) پر رحمت فرمایئے جیسا کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ۔" یہ ربوبیت کا تصور ہے جو انسان کے ذہن میں سب سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔

آگے چل کر صرف یہ فرق واقع ہوتا ہے کہ جوں جوں اس کا افقِ ذہنی وسیع ہوتا ہے اور اس کی فکر کا دائرہ پھیلتا ہے وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ والدین کے علاوہ مجھے اپنے بہن بھائیوں ' اعزّہ و اقرباء اور برادری کی حمایت اور تحفظ بھی حاصل ہے۔ جب وہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے تو اس میں یہ شعور اجاگر ہوتا ہے کہ معاملہ صرف رشتہ داروں اور برادری تک محدود نہیں ہے بلکہ مجھے ایک پورے نظام کی پشت پناہی حاصل ہے' میری قوم اور میرا ملک میری پشت پر ہے۔ جب اس کا ذہن مزید ترقی کرتا ہے تو اس سے آگے جاکر انسان کے مادی علم کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ اس کی ربوبیت اور اس کی ضروریات کی فراہمی کا تو ایک بڑا ہی وسیع و عریض نظام ہے۔ اس میں سورج کا بھی دخل ہے' اور ہواؤں کے چلنے ' بارش کے برسنے ' اور موسموں کے تغیر و تبدّل کو بھی ایک فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ کائنات کا یہ پورا

نظام اور اس کی ہر ہر چیز اس کی ربوبیت اور اس کی ضروریات کی کفالت کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ گندم کا ایک دانہ جو زمین سے اگتا ہے تو اس کو اگانے میں نہ معلوم قدرت کی کتنی قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ یہ انسان کے مادی علم کا نقطۂ عروج (Climax) ہے۔

اس کے بعد انسان اگر ایک چھلانگ اور لگا لے تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ سارا سلسلۂ اسباب ایک مسبب الاسباب کے ہاتھ میں ہے' یہ سارا نظام جو نگاہوں کے سامنے ہے ایک ایسی ہستی کے دستِ قدرت میں ہے جو نظر نہیں آ رہی۔ وہ ہمارے حواس اور ہماری قوتِ واہمہ سے بھی ماوراء ہے۔ لیکن وہ ہستی موجود ہے جو اس کائنات کی خالق بھی ہے' موجد بھی ہے' مدبر بھی ہے اور ربّ بھی ہے۔ اس کائنات کا سارا نظام اسی کے قانون میں جکڑا ہوا ہے اور اسی کی مرضی کے مطابق چل رہا ہے۔ "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" کے مطابق عالمِ امر میں بھی اسی کا قولِ کُن کارفرما ہے اور عالمِ خلق بھی اسی کی تدبیر کا مرہونِ منت ہے۔ جب یہ حقیقت واضح ہوگئی تو معلوم ہوا کہ اب انسان کو ربوبیت کی معرفتِ تامہ حاصل ہوگئی۔ اب اس نے جان لیا کہ میرا ربّ' میرا پالنے والا' میرا روزی رساں' میری ضروریات کا کفیل اللہ ہے جو میرا خالق بھی ہے۔ قرآن حکیم میں ربوبیت کو خلق پر مقدّم کرنے میں یہی رمز پوشیدہ ہے کہ انسان کو ربوبیت کا تصور پہلے حاصل ہوتا ہے۔

ربوبیتِ خداوندی کے دو مظاہر

عام طور پر جب ہم ربّ کی شرح کرتے ہیں تو بس ربوبیتِ جسمانی پر آکر ٹھہر جاتے ہیں' حالانکہ ربوبیت صرف جسم و جان کی ضروریات کی فراہمی تک محدود نہیں بلکہ ربوبیت یہ ہے کہ ہمارا رب جس طرح ہمارے جسم و جان کی ضروریات کی فراہمی کا اہتمام کر رہا ہے' اسی طرح وہ روح و عقل کی رہنمائی کا بھی بندوبست کر رہا ہے۔ جس طرح وہ ہمارے وجودِ خاکی کے داعیات اور تقاضوں کے لئے اسباب و سامان فراہم کرتا ہے اسی طرح وہ ہمارے ملکوتی وجود یعنی روح کی بالیدگی اور رہنمائی کے لئے بھی انتظام کرتا ہے۔ "رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ" کے الفاظ اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ میرا وہ

رب جس پر میری ربوبیت موقوف ہے وہی مجھے ہدایت دینے والا ہے' وہی راستہ دکھانے اور کھولنے والا ہے۔ تو انسان جب یہ معرفت حاصل کر لیتا ہے کہ جس کی بارگاہ سے میری تمام مادی ضروریات پوری ہو رہی ہیں میری عقل کی رہنمائی کا اہتمام اور میری روح کی تشنگی کی سیرابی کا انتظام و التزام بھی اسی کی طرف سے ہوگا تو اسے قرآن مجید "حکمت" سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ لقمان میں فرمایا: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ "اور بے شک ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ شکر کر اللہ کا!"۔ یعنی انہیں دانائی' سمجھ' عقل کی پختگی اور شعور کی گہرائی عطا کی گئی تھی جس کا نتیجہ شکرِ الٰہی ہے۔ چنانچہ عقل کی معرفت حاصل ہوتے ہی سارا جذبۂ شکر اللہ کی ذات کی طرف مرتکز ہو جائے گا۔ اسی حقیقت کا اظہار قرآن مجید کی پہلی آیت میں ہے کہ: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کہ ساری تعریف' حمد و ثنا' اور شکر و سپاس کا سزاوار اور مستحق صرف وہ اللہ ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

ربوبیت و تخلیق کی معرفت کا لازمی تقاضا

پس "يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ" کے الفاظ میں دعوتِ عبادتِ رب کے لئے یہ دلیل پنہاں ہے کہ تمہارا رب جس نے تمہاری جسمانی ربوبیت کے لئے کائنات کا یہ نظام بنایا اور تمہاری روح اور عقل کی رہنمائی کے لئے ارسالِ وحی' بعثتِ انبیاء و رسل اور انزالِ کتب کا سلسلہ قائم کیا اور جو تمہارا خالق بھی ہے وہی تمہاری بندگی اور پرستش کے لائق ہے' وہی تمہاری اطاعت اور محبت کا حق دار ہے۔ جب تم نے اپنے رب کو جان لیا اور تمہیں یہ معرفت حاصل ہوگئی کہ جو تمہارا خالق ہے وہی تمہارا رب اور مالک بھی ہے اور تم پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ نظامِ کائنات از خود چند لگے بندھے قوانین کے تحت نہیں چل رہا' بلکہ اس میں ہر آن اور ہر لحظہ اس کا حکم اور اس کا امر جاری و ساری ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ تم خود کو اپنے رب کے سامنے بچھا دو' اس کے آگے جھک جاؤ اور خود کو پست کر دو' اس کے سامنے تذلّل و خضوع اور عاجزی و انکساری اختیار کرو' کمالِ محبت' کمالِ شوق اور کمالِ رغبت کے ساتھ اس کے جملہ احکام کی اطاعت کرو' اس

کے تمام قوانین کی پابندی کرو اور اپنی زندگی پوری کی پوری اس کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال دو۔ یہ اس دعوت کا لازمی تقاضا ہے۔

"لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" کی تشریح

آیت کا آخری ٹکڑا (لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ) عبادتِ ربّ کے انجام و مآل اور اس کے ثمرہ و نتیجہ کو بیان کر رہا ہے کہ اے بنی نوعِ انسان! تمہیں عبادتِ ربّ کی دعوت اس لئے دی جا رہی ہے "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" تاکہ تم بچ جاؤ' تاکہ تم تقویٰ کی روش پر گامزن ہو سکو! تقویٰ کا اصل مفہوم ہے "بچ جانا" یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنا اور نتیجۃً اس کی ناراضگی اور سزا سے بچ جانا۔ اسی مفہوم سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اللہ کی اطاعت میں انسان خوب مبالغہ کرے' آگے بڑھے' تفاصیل میں جاکر اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے' اللہ کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہو اور انہیں اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے۔ یہ بھی تقویٰ ہے' لیکن تقویٰ کا اصل بنیادی مفہوم "بچ جانا" ہے۔ عربی لغت میں تقویٰ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کسی خاردار جنگل میں سے گزرتے ہوئے جس طرح جھاڑ جھنکاڑ اور کانٹوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کپڑوں کو سمیٹتا ہے کہ مبادا کسی کانٹے میں نہ الجھ جائیں۔ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے انسان سے یہی طرزِ عمل مطلوب ہے۔ یہاں جو فرمایا گیا " لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ " تو وہ اصل میں لغت کے اعتبار سے ہے "تاکہ تم بچ جاؤ"۔ یعنی عبادتِ ربّ کی دعوت قبول کرکے ہلاکت و بربادی اور دنیا میں افراط و تفریط کے دھکوں سے بچو گے۔ اور اگر عبادت رب کو اپنی زندگی میں اختیار نہ کیا' اپنی عقل کے پیچھے لگ گئے' اپنے مزمومہ خیالات و نظریات کا ساتھ دیا' اپنی باگ ڈور اپنے نفس کے ہاتھ میں دے دی' یا زمانہ کے چلن کے مطابق چلنا شروع کر دیا تو دھکے کھاؤ گے۔ کبھی ایک انتہا تک جاؤ گے اور پھر وہاں سے دھکا لگے گا تو دوسری انتہا تک جاؤ گے' اور اس طرح گیند کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتے رہو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ انسان دراصل افراط و تفریط کے مابین دھکے کھا رہا ہے۔ انسان نے جاگیردارانہ نظام سے بچ

نکلنے کی کوشش میں اپنے لئے جمہوریت کا نظام تجویز کیا' لیکن جمہوریت کا دور شروع ہوا تو اس میں وہ خباثتیں موجود تھیں جنھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی انتہائی کریہہ صورت اختیار کر لی اور یہ نظام Capitalism کی انتہا کو پہنچا۔ اس انتہا تک پہنچ کر انسان نے سوچا کہ وہ ایک تباہی اور ہلاکت سے دو چار ہو گیا ہے تو پھر واپس لوٹا' لیکن اس رجعت کے نتیجے میں دوسری انتہا تک جا پہنچا۔ اب اس نے اپنی عقل سے یہ نظام تجویز کیا کہ انفرادی ملکیت کو ختم کر کے تمام ذرائع و وسائل کو بالکلیہ ایک مرکزی نظام کے تحت لے آنا چاہئے۔ اس طرح انسان کی انفرادیت اور اس کی آزادی سلب ہو گئی اور انسانیت ختم ہو کر رہ گئی۔ اب سب کے سب انسان حیوانی سطح پر آ گئے اور پورا ملک ایک جیل خانہ بن گیا۔ یہ سب کیا ہے ؟ یہ در حقیقت انسان کا دھکے کھانا ہے۔ پس اگر انسان عبادتِ ربّ کی روش اختیار نہیں کرے گا اور خدا کی اطاعت اختیار کر کے اس کی مرضی کے مطابق نظام قائم نہیں کرے گا تو اسی طرح دھکے کھاتا رہے گا۔ ایک طرف جانے کے بعد پھر وہاں سے گھبرا کر واپس لوٹے گا لیکن پھر بھی اس کا قدم سواء السبیل پر نہیں ٹکے گا اور وہ ایک دوسری انتہا تک جا پہنچے گا۔ وہاں پہنچ کر کوئی اور ردِّ عمل پیدا ہو گا تو کہیں تیسری طرف جا نکلے گا۔ افراط و تفریط کے ان دھکوں سے بچ نکلنے کی واحد صورت یہی ہے کہ کہ عبادتِ ربّ کی اس دعوت پر لبیک کہا جائے اور اللہ کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لیا جائے۔ دنیا میں یہ وہ صراطِ مستقیم ' سواء السبیل اور قصد السبیل ہے جسے درمیانی راستہ کہا گیا ہے - یہ متوسط شاہراہ ایک ایسا عادلانہ نظام رکھتی ہے جو ہر اعتبار سے متوازن ہے' جس میں زندگی کے تمام تقاضوں کو اعتدال کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ یہ اللہ کی بندگی کا راستہ ہے اور اس کی اطاعت کا نظام ہے۔ اسے اختیار کر کے نوعِ انسانی دنیا میں افراط و تفریط کے دھکوں سے اور آخرت میں اللہ کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے بچ سکتی ہے۔ تو یہ ہے تقویٰ کا اصل مفہوم!

غور کا مقام

یہ بات سمجھ لینے کے بعد کہ قرآن کی اصل دعوت عبادتِ ربّ ہے اور اس کی

مخاطب کوئی ایک قوم، کوئی ایک گروہ یا کوئی ایک طبقہ نہیں، بلکہ علی الاطلاق پوری نوعِ انسانی ہے، ہمارے لئے غور کا اصل مقام یہ ہے کہ اس وقت اس دعوت کی امین امتِ مسلمہ ہے، جو بد قسمتی سے آج خود اس حال کو پہنچ گئی ہے کہ وہ خود اس بات کی محتاج ہے کہ اس تک یہ دعوت پہنچائی جائے۔ نوعِ انسانی تک قرآن کی یہ دعوت پہنچانا امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے، لیکن بجائے اس کے کہ ہم اس دعوت کو لے کر اٹھتے اور اپنے قول و عمل سے اسے نوعِ انسانی کے سامنے پیش کرتے ہم پستی کی اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ سب سے پہلے ہم خود محتاج ہیں کہ ہم کو یہ دعوت پہنچائی جائے۔ چنانچہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے ہم خود اس دعوت پر لبیک کہیں، اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو استوار کریں، اور پھر دنیا کے سامنے اس دعوت کے داعی بن کر کھڑے ہو جائیں۔

فرض عبادات کا بندگیٔ رب سے تعلّق

عبادت کے اس وسیع اور جامع مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب یہ جان لیجئے کہ فرض عبادات یعنی ارکانِ اسلام کا اس سے تعلق کیا ہے۔ میں اشارۃً عرض کر چکا ہوں کہ یہ عبادات اس عظیم عبادت یعنی خدا کے سامنے بچھ جانے کے لئے انسان کو تیار کرتی ہیں اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں ممدّ و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان عبادات کا دراصل بڑا ہی حکیمانہ نظام ہے۔ ان سے انسان میں وہ قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ صلاحیت و اہلیت اجاگر ہوتی ہے جس سے وہ عبادتِ ربّ کی راہ میں پیش آنے والے موانع کو دور کر سکتا ہے۔

نماز کا اصل مقصد: عبادتِ ربّ اور اطاعتِ خالق میں سب سے بڑی رکاوٹ جو انسان کو درپیش ہوتی ہے وہ غفلت، نسیان اور بھول ہے۔ انسان کا اپنے معمولات میں حد درجہ الجھ جانا اور منہمک ہو جانا، اور ان میں کولہو کے بیل کی طرح مصروف رہنا دراصل ایک ایسا چکر ہے جو انسان کو اپنے اندر گم کر لیتا ہے۔ اس لفظ "گم" سے میرا ذہن علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف منتقل ہوا ہے کہ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

تو انسان کی کیفیت عام طور پر یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماحول میں' اپنی ضروریات کی فراہمی میں' اور اپنی پریشانیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کاروبار کی فکر' ملازمت کی فکر' کام کی فکر' اہل و عیال کی فکر' بچوں کے دکھ اور بیماری کی فکر' بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شادی بیاہ کی فکر اور نہ جانے کتنے تفکرات کے روگ ہیں جو انسان کو لاحق رہتے ہیں اور جن میں وہ گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس گمشدگی کی حالت سے انسان کو نکالنے کے لئے نمازِ پنجگانہ کا نظام ہے۔ نماز انسان کو دن میں پانچ مرتبہ ان تمام مصروفیات سے کھینچ کر باہر نکالتی ہے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِی "نماز کو قائم کرو میری یاد کے لئے۔" دن میں پانچ وقت اللہ کے حضور کھڑے ہو اور ہر رکعت میں اپنے اس عہد و میثاق کو تازہ کرو کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ "پروردگار! ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے' اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔" ہر رکعت میں اپنے اس قول و قرار کی از سرِنو تجدید کر کے اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کر لو' اپنے بندہ ہونے کی حیثیت کو اپنے شعور میں اجاگر کر لو اور اس ہستی کو یاد رکھو جس سے تم نے یہ عہدِ وفاداری استوار کیا ہے۔ نماز کا اصل مقصد ہی یادِ الٰہی ہے اور اسی یادِ الٰہی سے ان حقائق کی تذکیر ہوتی ہے جن کا نام ایمان ہے۔ پس نماز وہ فریضہ ہے جو انسان کو اس گمشدگی کی حالت سے دن میں پانچ بار نکالتی ہے اور اسے یاد دلاتی ہے کہ وہ کسی کا غلام و بندہ ہے' کسی سے اس نے عہدِ اطاعت اور عہدِ وفا استوار کر رکھا ہے اور اسے اپنے تمام معمولات میں اس عہد و میثاق اور قول و قرار کی پابندی کرنی ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت: عبادتِ رب کے راستے کی دوسری سب سے بڑی رکاوٹ حُبِّ مال ہے۔ یہ مال کی محبت ہی ہے جو انسان کے پیر کی بیڑی بن جاتی ہے۔ انسان کی نگاہوں پر جو سب سے بڑا پردہ پڑ جاتا ہے وہ دنیا کی محبت کا ہے' جس کا سب سے بڑا مظہر اور سب سے بڑی علامت (Symbol) حُبِّ مال ہے۔ آپ تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ حُبِّ دنیا "حُبِّ مال ہی کا منطقی نتیجہ ہے' اس لئے کہ مال ہی وہ ذریعہ ہے جس سے آپ دنیا کی ہر چیز حاصل کر سکتے ہیں۔ شہرت' حشمت' وجاہت' عزت' منصب' اقتدار' غرضیکہ نفس کی ہر مطلوب شے مال کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے۔ شوکت و

سطوت اسی کی لونڈیاں ہیں اور تعیش و راحت اسی کے غلام ہیں۔ گویا کہ دنیا اور مال لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ مال کی محبت کو کم کرنے اور اس کو دل سے کھرچنے کے لئے زکوٰۃ کا نظام تجویز کیا گیا کہ اپنے مالوں میں سے زکوٰۃ' صدقات اور خیرات نکالو اور انہیں اللہ کی خوشنودی کے لئے صرف کرو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا: خُذْ مِنْ اَمْوٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ: ۱۰۳) یعنی ان کے اموال میں سے صدقات (واجبہ و نافلہ) وصول کیجئے کہ آپ اس کے ذریعے سے انہیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں—— مال کی محبت کو دل سے نکالنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ یہ مال ہی وہ چیز ہے جس کے لئے انسان حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرا لیتا ہے اور خدا کے احکام سے رُو گردانی کرتا ہے۔ چنانچہ حُبِ مال کے ازالے کے لئے علاج بالمثل تجویز کیا گیا کہ خرچ کرو اللہ کی راہ میں! اس طرح حبِ مال کی یہ نجاست دِل سے دھلے گی اور تمہارا تزکیہ ہو گا۔

روزہ کی حکمت: عبادتِ رب کی تیسری بڑی رکاوٹ ہمارے نفس کی خواہشات اور اس کے کچھ داعیات ہیں جو فی الاصل جائز خواہشات و داعیات ہیں اور ان میں سے کوئی بھی بجائے خود گناہ نہیں۔ ہمیں زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کھانے کی ضرورت ہے' ہم پانی کے محتاج ہیں' اسی طرح بقاءِ نسل کے لئے انسان کے اندر جنسی جذبہ رکھا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنی جگہ پر نہ صرف درست بلکہ ضروری ہیں۔ لیکن ان خواہشات و داعیات میں حدِ اعتدال سے تجاوز کا ایک مادہ موجود ہے اور جب یہ حدِ اعتدال سے تجاوز کرتی ہیں تو تقاضا کرتی ہیں کہ اصل حکم ہمارا چلے گا' تمہارا یا تمہارے خدا کا نہیں۔ نفس کے اندر جب ہیجان پیدا ہوتا ہے اور جنسی جذبہ اشتعال میں آتا ہے تو نفس گویا یہ مطالبہ کرتا ہے کہ میرا یہ تقاضا لازماً پورا ہونا چاہئے' مجھے کچھ معلوم نہیں کہ خدا کیا کہتا ہے' رسول کا کیا حکم ہے' حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے! نفس کے اس منہ زور گھوڑے کو قابو میں کرنے کے لئے اور اس کے تقاضوں اور داعیوں کو ایک فطری حد تک محدود رکھنے کے لئے روزہ فرض کیا گیا۔ اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ "اے وہ لوگو جو ایمان

لائے ہو! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم بچ سکو!" ـــــ خدا کے احکام کو توڑنے کی جسارت سے بچ سکو اور اس کی مقرر کردہ حدود کو پھلانگنے سے بچ سکو! تمہارے نفس کے جو بنیادی تقاضے تمہارے جسم میں ودیعت کئے گئے ہیں ان کو قابو میں کرنے کی استعداد اور قوت روزہ کی عبادت سے پیدا ہو گی۔ روزہ کی بدولت ان میں سے کوئی داعیہ بھی اتنا زور آور نہیں رہے گا کہ تم سے اپنی من مانی کرا سکے اور تم کو یہ بات بھلا دے کہ تم خدا کے بندے ہو اور خدا کے قانونِ حلال و حرام کے پابند ہو۔

حج کی جامعیت: اب رہا حج تو اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں وہ تمام چیزیں جمع ہوگئی ہیں جو ہمیں نماز، زکوٰۃ اور روزہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس میں یادِ الٰہی بھی ہے، وقتی طور پر علائق دنیوی سے کٹ جانا بھی ہے، انفاق مال بھی ہے، جسمانی مشقت بھی ہے اور نفس کے تقاضوں کو ضبط میں رکھنے کی مشق بھی ہے۔ چنانچہ حج ایک انتہائی جامع عبادت ہے۔

تو یہ چاروں عبادات انسان کو اس طرح تیار کرتی ہیں کہ وہ عبادتِ ربّ کے راستے پر گامزن ہو سکے جو اس کی غرضِ تخلیق ہے اور وہ اپنے اس عہد پر قائم رہ سکے جو اس نے دنیا میں آنے سے قبل عالم ارواح میں کیا تھا، جو سورۃ الاعراف میں بایں الفاظ مذکور ہے: "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ، قَالُوْا بَلٰى" یعنی جب ربّ تعالیٰ نے تمام بنی نوعِ انسان سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں تو سب پکار اٹھے کہ کیوں نہیں، ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ تو ہمارا ربّ ہے! اور جس عہد کی تجدید ہم پانچوں نمازوں کی ہر ہر رکعت میں کرتے ہیں۔ اسی ربّ کی غلامی اور بندگی کی دعوت آیت زیرِ مطالعہ میں دی جا رہی ہے کہ: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ زندگی گزارنے کے اس طریقہ پر اپنے آپ کو پوری طرح قائم رکھنے کے لئے ہمیں جن قوتوں کی ضرورت ہے اور اس کے موانع اور رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہمیں جو طاقت درکار ہے وہ ان عبادات کے نظام کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔

خلاصۂ کلام

آخر میں اس ساری بحث کا لُبّ لباب اور خلاصہ ذہن نشین کر لیجئے کہ بنی نوعِ انسان کے نام قرآن کا اصل پیغام اور اس کی اصل دعوت "بندگیٔ ربّ" کی دعوت ہے۔ یعنی انسان سے اس کی پوری زندگی میں کمال محبت و شوق کے ساتھ اللہ کی کامل اطاعت مطلوب ہے۔ عبادت محض نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ یہ فرض عبادات پوری زندگی کو خدا کی غلامی اور بندگی میں دینے کے لئے انسان کو تیار کرتی ہیں۔ "عبادتِ ربّ" کا راستہ کوئی آسان راستہ نہیں ہے۔ اس راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں اور Hurdles موجود ہیں، بڑے بڑے لالچ اور ترغیبات اور بڑی خوش نما اور لذت بخش چیزیں انسان کو اس راہ سے روکتی اور اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ان تمام رکاوٹوں کو دور کرنے اور ان لالچ اور ترغیبات سے بچنے کے لئے دین کے نظام میں یہ عبادات تجویز کی گئی ہیں۔ نماز ذکر سے غفلت اور نسیان کا علاج ہے۔ زکوٰۃ دل سے مال کی محبت کو کھرچنے اور حُبِّ دنیا کو کم کرنے کا ذریعہ ہے۔ روزہ نفس کے منہ زور گھوڑے کو لگام دینے اور اس کے تقاضوں اور داعیات کو حدِ اعتدال پر رکھنے کی مشق کے لئے فرض کیا گیا ہے۔ اور جیسے کہ عرض کیا گیا حج ان تینوں عبادات کی جامع عبادت ہے، جس میں ان کے تمام فوائد جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں ذکر بھی ہے، انفاقِ مال بھی ہے، نفس کے ساتھ رستہ کشی اور نظم و ضبط کی تربیت بھی ہے۔ جس طرح فوج کو ڈسپلن کا پابند اور خوگر بنانے کے لئے پریڈ کرائی جاتی ہے اسی طرح حج کی عبادت خدا کے سپاہیوں کو نظم و ضبط کا عادی بناتی ہے۔ یہ تمام عبادات انسان کو اصل عبادت کے لئے، جو اس کی غایتِ تخلیق ہے، ہمہ وقت تیار کرتی رہتی ہیں۔ اگر یہ حقیقت بنیادی طور پر سمجھ میں آ جائے تو پھر ان شاء اللہ دین کا پورا نقشہ واضح ہو جائے گا اور اس آیت کریمہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ جائے گا کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

"اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس ربّ کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، تاکہ تم (دنیا میں افراط و تفریط کے دھکے کھانے اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے دوچار ہونے سے) بچ جاؤ!!"

شہادت علی النّاس

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۴۳ کی روشنی میں

دین کا دوسرا اہم تقاضا
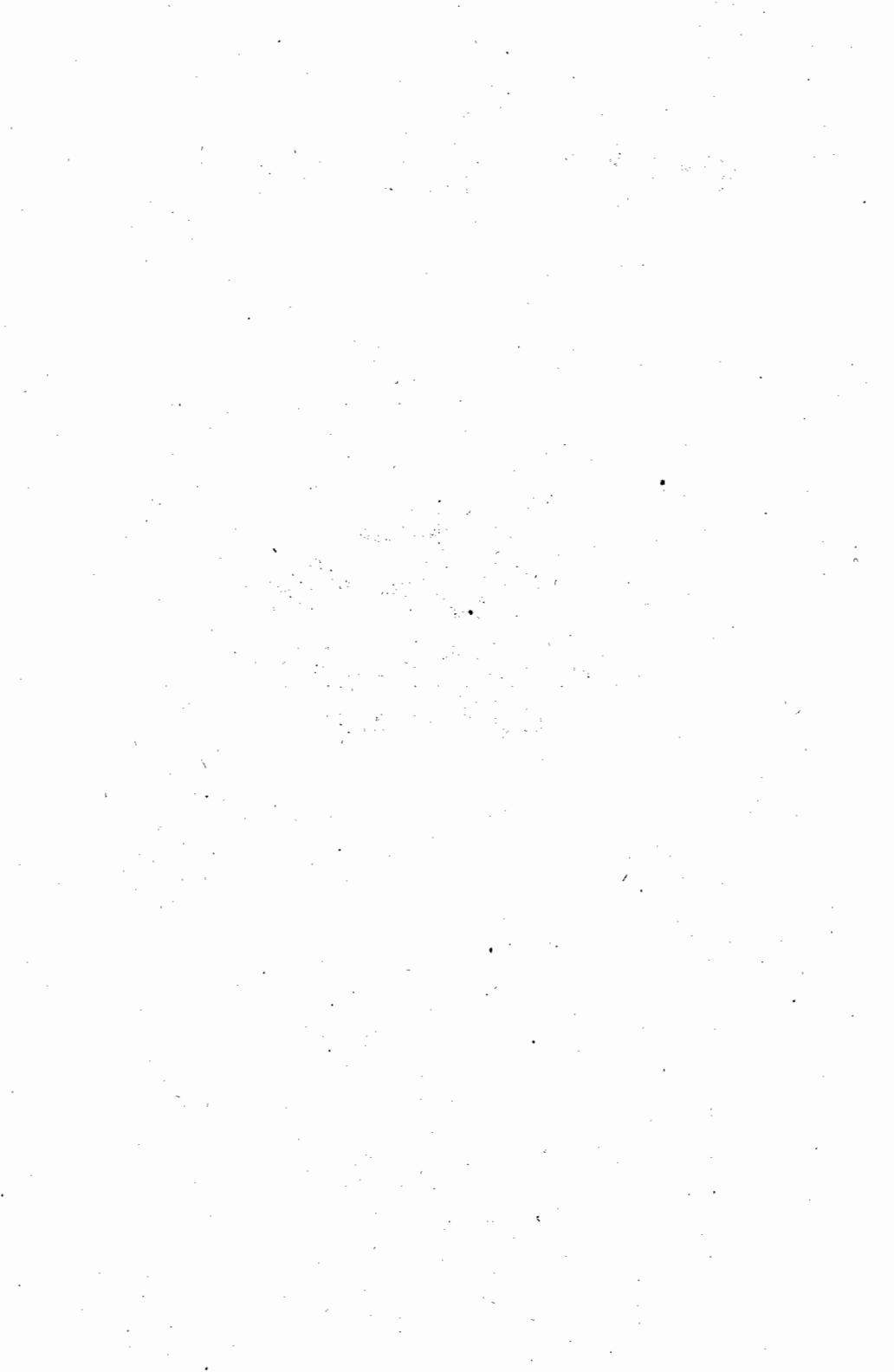
نَحمدہٗ و نُصلّی علیٰ رسولہ الکریم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰنِ الرّجیم - بسم اللّٰہ الرّحمٰنِ الرّحیمِ ○

مطالباتِ دین کے ضمن میں "فریضۂ بندگیٔ رب" کے بعد دین کا دوسرا عظیم مطالبہ اور تقاضا "شہادت علی النّاس" کے فریضہ کی ادائیگی ہے۔ یہ مطالبہ سورۃ البقرہ کے ۱۷ویں رکوع کی تیسری آیت میں ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتا ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ: ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امّت بنایا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے"۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اس آیتِ کریمہ کے بھی ایک ایک لفظ کو اچھی طرح سمجھیں اور اس کے ہر ہر لفظ کے حوالے سے وہ سبق' وہ ہدایت' اور وہ رہنمائی ذہن نشین کر لیں جو اس آیت کے ذریعہ ہر مسلمان کو انفرادی طور پر اور امّتِ مسلمہ کو اجتماعی طور پر دی جا رہی ہے۔

آیتِ مبارکہ کا محل و مقام

اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے سے قبل ضروری ہے کہ اس کے مقام اور محل کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے جس میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اور اس سلسلۂ کلام سے بھی واقفیت حاصل کر لی جائے جس کی یہ ایک اہم کڑی ہے۔ قرآن حکیم ایک مربوط کلام ہے اور اس کی ہر آیت سلسلۂ کلام سے ربط و تعلق رکھتی ہے۔ فہمِ قرآن کے لئے نظمِ آیات اور سیاق و سباق کا علم انتہائی ضروری ہے۔ لہٰذا اوّلاً ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کیا بحث اور گفتگو چل رہی ہے جس کے ضمن میں یہ آیتِ مبارکہ ایک اہم کڑی کی حیثیت سے وارد ہوئی ہے۔

"دعوتِ بندگیٔ رب" کے ذیل میں میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ البقرہ کے ابتدائی دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانی کرداروں کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ ایک وہ جو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے نازل کردہ اس کتابِ ہدایت سے مستفید ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کفرو ضلالت میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں اور ان پر تعصب اور ضد کا اتنا شدید غلبہ ہوگیا ہے کہ اب انہیں کوئی دعوتِ تبشیر و انذار نفع نہیں پہنچا سکتی۔ اور تیسرے وہ کہ جو بین بین ہیں، جو اگرچہ اپنے آپ کو اہلِ ایمان ہی میں شمار کرتے ہیں لیکن درحقیقت ان کو نفاق کا مرض لاحق ہے اور وہ اہلِ ایمان نہیں ہیں۔ تیسرے رکوع میں قرآن حکیم کی مرکزی اور آفاقی دعوت "دعوتِ بندگیٔ رب" بیان کی گئی ہے، جس پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ چوتھے رکوع میں حضرت آدمؑ کی تخلیق اور ان کو خلافتِ ارضی عطا کئے جانے کا ذکر ہے، پھر حضرت آدمؑ کے سامنے سر بسجود ہونے سے انکار پر ابلیس کے ساتھ پیش آنے والے معاملے اور حضرت آدمؑ و حوا اور ابلیسِ لعین کے ہبوطِ ارضی کا ذکر ہے۔ بعد ازاں پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک مسلسل دس رکوع بنی اسرائیل سے خطاب پر مشتمل ہیں۔ بنی اسرائیل کی حیثیت درحقیقت سابقہ امّتِ مسلمہ کی ہے۔ شریعتِ محمدیؐ سے قبل کی شریعت شریعتِ موسویؑ ہے اور بنی اسرائیل حاملینِ کتاب و شریعت تھے۔ اس مفصّل خطاب میں اس امّت (بنی اسرائیل) کے جو جرائم تھے، ان کی جو غلطیاں تھیں، انہوں نے جس جس طریقہ سے قانونِ خداوندی کی خلاف ورزیاں کی تھیں اور جس جس طرح اپنے فرائض سے کوتاہی کا ثبوت دیا تھا انہیں اس کی ایک مسلسل فردِ قراردادِ جرم سنائی گئی ہے۔ گویا بنی اسرائیل کے تمام جرائم کا ایک خلاصہ نکال کر ان دس رکوعوں میں رکھ دیا گیا اور پھر اعلان کیا گیا کہ اے بنی اسرائیل! ان جرائم کی پاداش میں تم "امتِ مسلمہ" کے مقام و مرتبہ سے معزول کئے جارہے ہو اور اب اس مقام پر تمہاری جگہ ایک نئی امت کو فائز کیا جارہا ہے اور وہ ہے امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس نئی امت کے لئے بیتُ اللہِ الحَرام ہی کو قبلہ مقرر کیا جارہا ہے جو ہمیشہ سے تھا، اور وہ قبلہ جو بنی اسرائیل کی امت کے لئے مقرر کیا گیا تھا یعنی بیت المقدس اس کو منسوخ کیا جارہا ہے۔ چنانچہ چودھویں رکوع میں بنی اسرائیل سے خطاب کے خاتمہ کے بعد پہلے بیت اللہ کی تاریخ بیان کی گئی اور اس کے معمارِ اوّل جناب حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ، اور جناب حضرت اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ نے خدا کے اس گھر کی تعمیر کے وقت اس کے حضور جو دعائیں کی تھیں ان کا ذکر آیا۔ پھر سترہویں رکوع میں تحویلِ قبلہ کا حکم آیا اور اس کے ساتھ ہی،

آیت زیرِ درس میں' امتِ محمدؐ کا امتِ وسط (بہترین امت) کے مقام پر فائز کئے جانے کا اعلان ہوا۔ تحویلِ قبلہ گویا اس امر کا اعلان (Declaration) ہے کہ بنی اسرائیل' جن کا قبلہ بیت المقدس تھا' آج اس مقام سے معزول کئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ امتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ منصب عطا کیا جارہا ہے۔ یہ ہے وہ سلسلۂ کلام جس کے ذیل میں یہ آیتِ مبارکہ وارد ہوئی ہے۔

امّتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس

اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں درحقیقت اس امت کی غرضِ تاسیس بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ امت کیوں بپا کی جارہی ہے' اس کا قیام کس لئے عمل میں لایا جارہا ہے؟ چنانچہ فرمایا گیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

"اور اسی طرح ہم نے بنایا تم کو امّتِ وسط (بہترین امت) تاکہ ہوجاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر اور رسولؐ ہوجائیں گواہ تم پر"

اس آیتِ مبارکہ میں سب سے پہلا لفظ "کَذٰلِکَ" ہے جس کا ترجمہ ہوگا: "ایسے ہی" یا "اسی طرح" ـــ گویا کہ اس کلمہ "کذٰلک" نے اس اعلان کو تحویلِ قبلہ کی بحث کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ یعنی جو تحویلِ قبلہ کا حکم دیا جارہا ہے اسے کوئی معمولی سا واقعہ نہ سمجھو۔ یہ تو درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اب امّتِ بنی اسرائیل کا وقت ختم ہوا' وہ معزول کردیئے گئے' ان کا قبلہ منسوخ کردیا گیا اور اب اس قبلہ ابراہیمی کے گرد ایک نئی امت امتِ محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی تاسیس و تشکیل ہورہی ہے' جسے "شہادت علی النّاس" کی ذمہ داری سونپی جارہی ہے۔ اس سے پہلے جو ذمہ داریاں بنی اسرائیل کے سپرد کی گئی تھیں وہ اب اس نئی امت کے سپرد کی جارہی ہیں۔ "کذٰلک" کا مفہوم دراصل یہ ہے ـــ

لفظ "امت" کیوں استعمال ہوا؟

. "کذٰلک" کے بعد الفاظ ہیں: "جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا" (ہم نے تم کو بنایا درمیانی امت یا بہترین امت!) اس ٹکڑے میں سب سے پہلے لفظ "امت" پر غور کیجئے۔ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے قرآن مجید کی اصل اصطلاح "امت" ہے۔پورے قرآن مجید میں مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کو ظاہر کرنے کے لئے کہیں بھی لفظ " قوم" استعمال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح حدیث نبویؐ میں بھی مسلمان امت کے لئے"قوم" کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ قومیت کا جو تصور ہمیشہ سے چلا آرہا ہے وہ یہ ہے کہ قومیں یا تو نسل کی بنیاد پر بنتی ہیں یا علاقہ' ملک' وطن اور زبان کی بنیاد پر۔ یہ وہ عوامل ہیں جن کو ایک قوم کے تشخص میں اساسی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی خاص ملک کی حدود میں رہنے والے ایک علیحدہ قوم کہلاتے ہیں' کوئی ایک زبان بولنے والے ایک الگ قوم تصور کئے جاتے ہیں۔ لیکن قومیت کا یہ تصور ہمارے دین' ہماری تہذیب' ہمارے تمدن' اور ہماری روایات سے بالکل متناقض ہے۔ قرآن و حدیث کی رُو سے اس کا ہماری ہیئتِ اجتماعیہ سے قطعاً کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ہماری ہیئت اجتماعیہ کے لئے اس لفظ "قوم" کو سرے سے استعمال ہی نہیں کیا۔

"دعوتِ بندگیٔ ربّ" کے ضمن میں عرض کیا جاچکا ہے کہ تمام سابق انبیاء علیہم السلام کی دعوت اپنی اپنی قوم کے لئے تھی اور ان کا کلمۂ خطاب "یَا قَوْمِ" (اے میری قوم کے لوگو!) ہوتا تھا۔ لیکن محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مخاطبین کے لئے قرآن حکیم میں "یَا قَوْمِ" کی بجائے "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" (اے بنی نوعِ انسان!) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ گویا یہ قومیت سے ایک بلند تر منزل اور اس سے اعلیٰ وارفع ایک مقام ہے کہ جہاں سے اب بات شروع کی جارہی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کرلیا ہے' جنہوں نے عبادتِ ربّ کے نظریہ کو تسلیم کرلیا ہے' جو خدا کے ساتھ اطاعت و فرمانبرداری کا عہد استوار کررہے ہیں وہ اب مل جل کر ایک جمعیت بنیں گے تو ان کی ہیئتِ اجتماعیہ کو"قوم" سے تعبیر نہیں کیا جائیگا' بلکہ اس کے لئے قرآن مجید کی اصل

اصطلاح "امت" ہے۔ ماہرینِ لغت نے امت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ایسے افراد پر مشتمل ایک ہیئتِ اجتماعیہ جن کے مابین کوئی قدرِ مشترک' کوئی امرِ جامع یا چند ایسے مسلّمہ اصول ہوں جو انہیں جوڑے رکھیں۔ چنانچہ ہماری جمعیت کے لئے اصل لفظ "امت" کا ہے۔ دوسرا لفظ جو مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے بولا جاتا ہے اور خصوصًا ہماری شاعری میں بہت زیادہ مستعمل ہوگیا ہے وہ لفظ "ملت" ہے۔ لیکن اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ قرآن مجید میں لفظ ملت نہ تو قوم کے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ ہی امت کے۔ بلکہ ملت کا اصل ترجمہ ہے " طریقہ' کیش"۔ ملتِ ابراہیمؑ کا مفہوم ہوگا" ابراہیمؑ کا طریقہ " چنانچہ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے لفظ ملت کا استعمال بھی درست نہیں' بلکہ لفظ امت ہی اس مفہوم کی ادائیگی کرتا ہے۔ اس مفہوم کے لئے قرآن مجید کا دوسرا لفظ "حزب" ہے جس کا صحیح ترجمہ "پارٹی" ہوگا۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا "اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ" کہ یہ اللہ کی پارٹی ہے' اللہ کی جماعت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اللہ کے ساتھ عہدِ وفاداری استوار کیا ہے اور اس کی اطاعت کا قلادہ اپنے گلے میں پہن لیا ہے۔ رہا باقی لوگوں کا معاملہ تو جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ عہدِ اطاعت استوار کیا ہے تو وہ سب کے سب "حزبُ الشیطان" ہیں۔ اس طرح قرآن مجید پوری نوعِ انسانی کو دو جماعتوں یا دو پارٹیوں میں تقسیم کرتا ہے ـــــ ایک حزبُ اللہ یعنی اللہ کی پارٹی اور دوسری حزبُ الشیطان یعنی شیطان کی پارٹی۔ مقدم الذکر کے بارے میں فرمایا گیا: اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○ " یہ ہیں وہ لوگ جو اللہ کی جماعت ہیں اور اچھی طرح سمجھ لو کہ (انجام کار کے طور پر) اللہ کی جماعت کے لوگ ہی کامیاب ہونے والے ہیں"۔ سورۂ آل عمران میں بھی ہماری ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے یہی لفظ "امت" استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ "تم بہترین امت ہو"۔ اس ساری گفتگو کے نتیجہ میں لفظ امت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے ـــ جو لوگ دعوتِ عبادتِ ربّ کو قبول کریں گے چاہے وہ کوئی ہوں' مغرب سے ہوں یا مشرق سے' شمال کے ہوں یا جنوب کے' کوئی زبان بولتے ہوں' کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں' کسی شکل و صورت اور رنگ کے حامل ہوں' وہ سب بلا امتیاز ایک مجموعۂ افراد بن گئے اور وہ از رُوئے قرآن "امتِ مسلمہ" کے رکن قرار پاگئے۔

"امّتِ وسط" کا مفہوم

اس آیۂ مبارکہ میں "امت" کی صفت کے طور لفظ "وسط" استعمال ہوا ہے' جس کا لغوی مفہوم "درمیانی" ہے۔ چنانچہ "اُمۃً وسطًا" کا لفظی ترجمہ ہوگا "ایک درمیانی امت"۔ بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ "بہترین امت" کیا ہے' جسے ترجمہ کی بجائے ترجمانی کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ جو چیز درمیانی ہو' وہی بہترین ہوتی ہے۔ جو چیز دو انتہاؤں (Extremes) کے درمیان ہو' معتدل ہو' جس کے اندر ہر اعتبار سے توازن پایا جاتا ہو' وہی شے بہترین گردانی جائے گی۔ لہٰذا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ بالعموم یہی کیا جاتا ہے کہ "اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا...." اس مفہوم کی تائید سورۂ آل عمران کی اس آیتِ مبارکہ سے ہوتی ہے کہ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" یعنی تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کی راہنمائی کے لئے برپا کیا گیا ہے' تم بہترین مجموعہ افراد ہو' تم پوری نوعِ انسانی کا "مکھن" ہو' تم ہی نوعِ انسانی کے لئے بمنزلۂ نمک ہو' تم سے نمکینی حاصل کی جائے گی۔ اللہ کی ہدایت کی امانت تمہارے پاس ہوگی اور نوعِ انسانی اس ہدایت سے استفادہ کرے گی۔ پس یہ مفہوم ہوا "امّتِ وسط" کا جس کی تائید ہمیں سورۂ آل عمران کی "خیرِ امت" والی آیت سے مل گئی۔

"امتِ وسط" کا ایک دوسرا مفہوم بھی لیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ لفظِ وسط "واسطہ" کا مفہوم رکھتا ہے۔اس اعتبار سے "امتِ وسط" کا مفہوم خدا اور انسانوں کے مابین واسطوں میں سے ایک واسطہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے مابین وسائط کا ایک سلسلہ ہے جس کی پہلی کڑی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ جن کے واسطہ سے ہدایتِ خداوندی محمدؐ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ دوسرا واسطہ خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے کہ پوری نوعِ انسانی ہدایت کے لئے آنحضورؐ کی محتاج ہے۔ نوعِ انسانی اگر ہدایتِ ربانی حاصل کرنا چاہتی ہے' وہ خدا سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں' حق کیا ہے' باطل کیا ہے' صحیح کیا اور غلط کیا ہے تو اس کے لئے وہ مجبور ہے کہ یہ ہدایت محمدؐ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس سلسلۂ وسائط کی تیسری کڑی ہے امتِ محمدؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام—

اس لئے کہ نبی اکرمؐ کی طرف سے ہدایت کی امانت امت کو منتقل ہو گئی۔ حضورؐ نے سرزمینِ عرب کی حد تک اپنے فریضۂ تبلیغ و رسالت کی بنفسِ نفیس تکمیل فرما کر یہ ذمہ داری امت کو منتقل فرمادی۔ قرآن حکیم میں وحی کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بایں الفاظ بیان کی گئی ہے: وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (۱۹:۶) "اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا تاکہ اس کے ذریعے تم کو اور جس جس کو یہ (قرآن) پہنچے ان سب کو خبردار کروں"۔ جس کو یہ قرآن پہنچ جائے اس پر درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمامِ حجت ہو جائے گا۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کی روشنی کو عام کرنا اور دنیا بھر کے انسانوں تک پہنچانا امت کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ بنی نوعِ انسان کے لئے ہدایت و رہنمائی کا جو سلسلہ قائم ہوا ہے اس میں پہلا واسطہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا' دوسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کا اور تیسرا واسطہ امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ یہ امت اسی لئے "امتِ وسط" کہلاتی ہے کہ یہ اس سلسلۂ ہدایت کی ایک کڑی اور ایک واسطہ ہے۔

اس بات کی تائید اسی آیۂ مبارکہ کے اگلے ٹکڑے سے ہو رہی ہے' جہاں فرمایا گیا: لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ــــ "تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر اور رسول گواہ ہو جائیں تم پر"۔ تو گویا یہاں وسائط کا وہ سلسلہ واضح کیا جا رہا ہے کہ اے امتِ محمدؐ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تم تک ہماری کتابِ ہدایت اور دینِ حق کی تبلیغ' تعلیم اور تبیین کا حق ادا کر دیا۔ آپؐ اپنے قول اور اپنے عمل سے حق کی شہادت دے چکے اور اللہ کی اطاعت پر مبنی نظامِ زندگی بالفعل قائم کر کے دکھا چکے۔ یہ گویا رسولؐ کی گواہی ہو گئی تم پر ــــ اور اب یہی گواہی بنی نوعِ انسان پر قائم کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یعنی اب تمہیں اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتابِ ہدایت اور دینِ حق کو عملاً نافذ کر کے دنیا کے سامنے حق کی شہادت دینی ہے۔

امتِ مسلمہ کا اجتماعی نصب العین

آیت کے اس ٹکڑے پر ایک اور پہلو سے غور کیجئے۔ "لِتَكُوْنُوْا" کے آغاز میں جو

حرفِ "لام" آیا ہے یہ "لامِ غایت" بھی ہے جو ایک مقصد کو معیّن کر رہا ہے "تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ!" ـــــ یعنی تمہاری جمعیت جسے "امتِ وسط" کا نام دیا گیا ہے ایک بے مقصد جمعیت نہیں ہے' بلکہ اس کا ایک معیّن مقصد اور ایک مقرر نصب العین ہے۔ تمہاری ہیئتِ اجتماعیہ دنیا کی تمام ہیئاتِ اجتماعیہ سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ تمام اقوامِ عالم اپنے لئے جیتی ہیں' لیکن تمہیں نوعِ انسانی کے لئے زندہ رہنا ہے۔ ان کے پیشِ نظر اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ اپنی عزت' اپنے وقار' اپنے مسائل' اپنے مفادات اور اپنی آزادی کے تحفظ کی فکر کریں اور اپنی روایات اور اپنی مصلحتوں کا لحاظ رکھیں۔ لیکن تمہارا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس ضمن میں سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ

"تم وہ بہترین امت ہو' جسے بنی نوعِ انسان (کی فلاح و بہبود) کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو' منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر (پختہ) ایمان رکھتے ہو"۔

یعنی لوگوں کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا اس "خیرِ امت" کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد خود اپنے ذاتی مفادات کا حصول اور اپنے مسائل کا حل نہیں ہے بلکہ ہماری ہیئتِ اجتماعیہ کی اصل غرضِ تاسیس نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی ہے۔ آیۂ زیرِ مطالعہ میں "لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" کے الفاظ امت کے اسی آفاقی اور اجتماعی نصب العین کو بیان کر رہے ہیں۔

قوموں کے لئے اجتماعی نصب العین کی اہمیت

کسی بھی مجموعۂ افراد اور ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے ایک اجتماعی نصب العین ناگزیر ہوتا ہے' جس کے بغیر اس ہیئتِ اجتماعیہ کی حیثیت بے لنگر کے اس جہاز کی سی ہوتی ہے جس کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی اور وہ لہروں کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں جو قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک حالات دن بدن ابتر ہوتے چلے گئے ہیں تو

اس کا اصل سبب میرے نزدیک یہی ہے کہ ہمارا کوئی آفاقی اور اجتماعی نصب العین ہے ہی نہیں۔ ہم ایک ایسی قوم اور ایک ایسا مجموعۂ افراد بن کر رہ گئے ہیں کہ جن کے سامنے کوئی اجتماعی نصب العین سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے ذاتی معاملات و مسائل میں غلطاں و پیچاں' اپنے ذاتی مفادات و اغراض کے حصول میں کوشاں اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس کے سامنے اس کی مساعی' اس کی جدو جہد اور اس کی کوشش و محنت کا کوئی دوسرا ہدف اور اس کی صلاحیتوں اور اوقات کا کوئی دوسرا مصرف سرے سے موجود ہی نہیں۔ لہٰذا اس کی ساری تگ و دو اور دوڑ دھوپ کا مرکز و محور یہی بن کر رہ گیا ہے کہ وہ اپنا گھر سجائے' اپنی بلڈنگیں اونچی کرے' اپنے کاروبار کو مزید ترقی دے' اپنے آرام و آسائش کے لئے زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کرے' اپنی کاروں کے ماڈل ہر سال بدلتا چلا جائے اور زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے تعیش کی نت نئی راہیں تلاش کرے۔ اجتماعی نصب العین کے فقدان کے سبب سے ہماری قومی زندگی ایک بہت بڑے خلا کا شکار ہو کر رہ گئی ہے' جس کے ہولناک نتائج ہم بھگت رہے ہیں۔ ہمارے ہاں کسی کے اندر قربانی اور ایثار کا کوئی جذبہ نہیں' اپنے ہم جنسوں کی ہمدردی کا کوئی مادہ نہیں۔ جہاں تک دنیا کی دوسری اقوام کا تعلق ہے تو ان کی قومیت کی تاسیس چاہے غلط بنیادوں پر ہوئی ہو لیکن یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ وہ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ چاہے نسل کی بنیاد پر قوم بنے ہوں' چاہے وطن اور علاقہ کی بنیاد پر' لیکن ان میں جب ایک "قوم" ہونے کا شعور پختہ ہو جاتا ہے تو ان کے نزدیک اپنے ذاتی مقاصد اور مفادات ثانوی درجہ کے حامل ہو جاتے ہیں اور ان کی نگاہوں میں اصل اہمیت ایک قومی نصب العین کو حاصل ہو جاتی ہے۔ ان میں یہ احساس اجاگر ہو جاتا ہے کہ ان کو اپنی قومی عظمت کے لئے کام کرنا ہے' اپنی قوم کے مفاد کے لئے کوشش کرنا ہے' اپنے وطن کی عظمت اور اس کا نام اونچا کرنے کے لئے کام کرنا ہے۔ لیکن ہم وہ بد نصیب قوم ہیں کہ جو اپنے نصب العین ہی کو بھلا بیٹھی ہے۔ یاد رہے کہ قومیت کا نعرہ ہم کو کبھی اپیل نہیں کر سکتا' اس لئے کہ یہ تصور ہماری روایات اور تعلیمات سے بالکل متصادم ہے۔ زبان و نسل' رنگ و خون اور علاقہ و وطن کی بنیاد پر ہم کبھی بھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ ہم خواہ کتنے ہی بگڑ جائیں اور کیسی ہی پستی میں گر جائیں' لیکن

یہ چیزیں ہمیں کبھی بھی اپیل نہیں کرسکیں گی' اس لئے کہ آخر ہماری ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ ہے' ہماری تابندہ روایات ہیں' اور ماؤں کے دودھ کے ساتھ جو تعلیم ہمارے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اس میں یہ بات بھی بہرحال موجود ہے کہ یہ چیزیں ہمیں کبھی بھی اجتماعی حیثیت سے متأثر نہیں کرسکیں گی۔ ایک طرف یہ خوبی ہے' لیکن دوسری طرف ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ ہمارا اصل نصب العین ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوچکا ہے اور اس کا ہمیں شعور حاصل نہیں رہا۔ لہٰذا اب ہم اس خلا کے اندر زندگی بسر کررہے ہیں اور بے لنگر جہاز کی طرح موجوں کے رحم و کرم پر ہچکولے لے رہے ہیں۔

اس مسئلہ پر میں ایک بات مزید عرض کردینا چاہتا ہوں کہ کسی قوم کے سامنے اجتماعی نصب العین کے ہونے یا نہ ہونے سے کتنا عظیم الشان فرق واقع ہوتا ہے۔ آج دنیا کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ اور اکثر یورپی ممالک کی نوجوان نسل اس خلا سے دوچار ہے کہ اب ان کے سامنے کوئی اعلیٰ و ارفع نصب العین اور مقصد نہیں ہے' اس لئے کہ بحیثیت قوم ان کے سامنے جو سب سے اونچا نصب العین ان کے بزرگوں اور مفکروں نے پیش کیا وہ یہ تھا کہ ایک فلاحی ریاست (Welfare State) قائم ہونی چاہیے اور تمام لوگوں کا معیار زندگی بلند ہونا چاہیے۔ اب کم از کم امریکہ کے اندر تو وہ معیار زندگی اس مقام کو پہنچ چکا کہ اس سے زائد کی توقع عبث ہے۔ وہاں حالت یہ ہے کہ اگر ایک گھر میں افراد چھ ہیں تو کاریں سات ہیں۔ ان حالات میں نئی نسل کے ایک امریکی نوجوان کے سامنے اب کیا مقصد اور کون سا نصب العین رہا؟ اب وہ کس کام کے لئے محنت کرے اور کس آئیڈیل کو اپنی مساعی کا ہدف بنائے؟ لہٰذا وہاں خلا کا ایک احساس ہے کہ بڑھتا جارہا ہے۔ آج ہمیں سڑکوں پر جو ہپی (Hippy) گھومتے نظر آرہے ہیں اور مغرب میں جو سماج دشمن رجحانات (Anti Social Trend) بڑھتے جارہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نوجوان نسل اُس دَور کی طرف لوٹ جانا چاہتی ہے جس میں انسان تہذیب و تمدن سے بالکل عاری تھا اور وہ پہاڑوں کی غاروں کے اندر رہا کرتا تھا۔ یہ وحشیوں کے طریقے پر بڑھے ہوئے بال اور ناخن' یہ میلا اور گندا رہنے کا مذموم جذبہ' یہ دراصل ردِعمل ہے ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین کے فقدان کا۔ یہ نہ سمجھیے کہ چند سر پھرے نوجوانوں نے ہپی ازم کو اختیار کرلیا ہے اور وہ جہاں گردی کے لئے نکل کھڑے

ہوئے ہیں' بلکہ جن لوگوں کو امریکہ اور یورپ کی سیاحت کا اتفاق ہوا ہو وہ جانتے ہیں کہ چند بڑے بڑے افسروں (Executives) 'صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کو چھوڑ کر وہاں کے بازاروں میں نوجوانوں کے غول کے غول اسی ہپی فیشن میں نظر آتے ہیں اور یہی نقشہ ان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں نظر آتا ہے۔

اس کے برعکس چین کے نوجوانوں میں یہ نقشہ بالکل نظر نہیں آئے گا۔ وہاں پر یہ مسئلہ اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ ان کے سامنے بہرحال ایک اجتماعی نصب العین موجود ہے۔ ان کے ذہنوں میں ایک بات رچائی اور بسائی گئی ہے اور کم از کم ہر چینی نوجوان اس جذبے سے سرشار ہے کہ اسے اپنے گردو پیش اشتراکی انقلاب (Communist Revolution) برپا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایثار' قربانی' جدوجہد' محنت و کوشش اور مقصد کی لگن ان کے ہاں قومی سطح پر موجود ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کسی قوم کے پیشِ نظر ایک اجتماعی نصب العین ہونے یا نہ ہونے سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔

یہ بات تحریکِ پاکستان کے حوالے سے اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ مسلم لیگ کی تحریک کو تقویت اسی وقت حاصل ہوئی جب اس نے پاکستان کے مطالبہ کو ایک "نصب العین" کی حیثیت سے اختیار کیا۔ لیکن پاکستان کے قیام کے بعد چونکہ قوم کو کوئی واضح نصب العین نہیں دیا گیا لہٰذا یہاں قومی سطح پر نصب العین کا ایک خلا واقع ہوگیا۔ چنانچہ یہاں ہر فرد کی مساعی کا ہدف' اس کی جہد و کوشش کی غرض و غایت' اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز و محور اور اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ رہا کہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ آسائش و آرام اور حصولِ معاش کے ذرائع تلاش کرے' زیادہ سے زیادہ الاٹمنٹ کرائے اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے میں لگ جائے۔ لہٰذا یہی چیزیں ہر فرد کا ذاتی نصب العین بن کر رہ گئیں اور اجتماعی نصب العین اس نفسانفسی میں گم ہو کر رہ گیا۔

چنانچہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہمارے سامنے کوئی آفاقی اور اجتماعی نصب العین ہو۔ یہ ضرورت صرف مذہبی اور دینی لحاظ سے اور صرف آخرت کی جواب دہی کے اعتبار سے ہی نہیں ہے' بلکہ قومی زندگی کے اعتبار سے' ہمارے ملّی تشخّص کے اعتبار سے' اور نوجوان نسل کے سامنے زندگی کا ایک ارفع و اعلیٰ نصب العین لانے کے اعتبار

سے ہمارے لئے لازم اور ناگزیر ہے کہ اس ملک کے رہنے والے مسلمانوں میں یہ شعور اجاگر کیا جائے کہ بحیثیتِ امّتِ مسلمہ ہمارا نصب العین کیا ہے اور ہماری انفرادی و اجتماعی مساعی اور جدّوجہد کو کس مرکز و محور کے گرد مرتکز ہونا چاہئے۔ اس اعتبار سے یہ آیۂ مبارکہ ہمارے لئے بہت اہم ہے کہ یہ امتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس اور اس کا اجتماعی نصب العین بیان کر رہی ہے۔

"شہادت" کا مفہوم اور دین میں اس کا مقام

اس آیت میں "شَہِیْد" کا جو لفظ آیا ہے اس کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ اس کا لفظی ترجمہ "گواہ" ہے۔ فرمایا گیا: "تاکہ تم ہو جاؤ گواہ نوعِ انسانی پر اور رسولؐ ہو جائیں گواہ تم پر"۔ اولین گواہی انسان کے اپنے قول اور زبان سے ہوتی ہے۔ ایک شخص زبان سے اقرار کرتا ہے کہ **اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ** ــــــ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں" ــــــ تو یہ قولی گواہی ہے جس سے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر عملی گواہی کا درجہ آتا ہے۔ اور دنیا میں اصلاً وہی گواہی معتبر قرار پاتی ہے جس کی تائید انسان کے عمل سے ہو رہی ہو۔ اگر آپ قولاً ایک بات کا اعلان مگر عملاً اس کی تکذیب کر رہے ہوں تو دنیا اس بات کو معتبر نہیں مانے گی۔ معتبر بات وہی ہو گی جو عمل سے ثابت ہو جائے۔ لہٰذا قولی شہادت کے ساتھ اس کی عملی گواہی بھی زندگی کے پورے رویّے سے لازمی طور پر ملنی چاہئے۔ کلمۂ شہادت ادا کرنے سے ہم نے اللہ کے معبود ہونے، مطاعِ مطلق ہونے، حاکم و مالک ہونے اور خالق و ربّ ہونے کا اقرار کیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانا ہے، انہیں اس کا فرستادہ اور نمائندہ تسلیم کیا ہے۔ اس تصدیق و تسلیم اور عہد و میثاق کی بدولت ہمیں "**یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا**" سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ لہٰذا ہم پر لازم ہو گیا کہ ہماری عملی زندگی بھی اس کی شہادت دے اور ہم میں سے ہر فرد عملی طور پر اللہ کا بندہ، غلام اور مطیع فرمان بن جائے۔ اس کی زندگی کا ہر عمل اور فعل اس بات کی گواہی دے رہا ہو کہ یہ شخص خود مختار نہیں ہے، یہ من مانی کرنے کے لئے آزاد نہیں

ہے' یہ زمانہ کے چلن کے ساتھ چلنے کا مجاز نہیں ہے' بلکہ یہ ایک پابند شخصیت ہے جو چند بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے ایک معیّن منزلِ مقصود اور نصب العین ہے اور اس کا ہر قدم اپنی منزل ہی کی سمت میں اٹھتا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک رُخ متعین ہو چکا ہے اور زندگی کے ہر دوراہے کے لئے اسے ہدایت دے دی گئی ہے کہ اسے کس راہ پر چلنا ہے اور کس پر نہیں چلنا ہے۔ غرضیکہ اس کے ہر کام اور ہر حرکت کے لئے طے کر دیا گیا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ انسان کی عملی زندگی کی اس گواہی سے در حقیقت اس قولی گواہی **"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ"** کا انفرادی سطح پر حق ادا ہو گا۔

اب اس سے آگے بڑھیے۔ ہماری حیثیت چونکہ محض ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک امت کی ہے' لہٰذا ہمیں یہ عملی گواہی صرف انفرادی سطح پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر بھی دینی ہو گی۔ اس اعتبار سے جب تک ہماری پوری کی پوری اجتماعی زندگی یعنی ہمارا ملکی نظام' ہمارا آئین و دستور' ہمارے تمام قوانین' ہماری معیشت' معاشرت' تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت غرضیکہ ہماری اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ اللہ کے نازل کردہ دین و شریعت کے سانچے میں ڈھل نہیں جائے گا اس وقت تک عملی گواہی کا حق ادا نہیں ہو گا۔ اس عملی گواہی کی تکمیل اس وقت ہو گی جب اللہ کی اطاعت پر مبنی نظامِ حیات نوعِ انسانی کو اپنی کامل صورت میں قائم و نافذ نظر آئے' ورنہ امت کتمانِ حق کی مجرم شمار کی جائے گی ـــــــ اور جو شخص حق کی یہ گواہی دینے کے لئے نقدِ جان نچھاور کر دے اسے مالکِ ارض و سماء کی بارگاہ سے "شھید" کا خطاب ملتا ہے اور اس کی گواہی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی جاتی ہے کہ یہ ہے وہ سچا گواہ جس نے جان کی بازی لگا کر اس بات کی گواہی دے دی کہ اس کائنات کا ایک ہی مالک اور ایک ہی معبود ہے۔ اس نے جان پر کھیل کر دراصل یہ اعلان کیا ہے کہ: **اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ** کہ اللہ کے سوا اور کسی کو حکم کا اختیار نہیں اور اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو! یہی دینِ قیم ہے' یہی قائم و مستحکم دین ہے !!

لفظ "شہادت" کی مندرجہ بالا بحث سے ہمارے دین میں اس کی اہمیت اور اس کا مقام واضح ہوتا ہے۔ شہادت ہی سے ہمارے اسلام کا آغاز ہوا۔ ہم کلمۂ شہادت کا اقرار

کر کے امتِ مسلمہ میں شامل ہوئے اور مسلمان قرار پائے۔ اور اب جو ہماری بلند ترین منزل ہو سکتی ہے وہ "مقامِ شہادت " ہے' جو اللہ کی راہ میں نقدِ جان کا نذرانہ دے کر حاصل ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن　　　نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی!

فریضۂ شہادت علی النّاس کی اہمیت

بحیثیتِ امتِ مسلمہ ہماری ساری اجتماعی مساعی کا ہدف' ہماری ساری اجتماعی زندگی کا مرکز و محور اور ہماری زندگی کا نصب العین "شہادتِ حق" یعنی اللہ کی گواہی دینا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ (آیت ۸) میں ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ

کہ اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لئے' اللہ کا جھنڈا اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ اور پوری دنیا کے سامنے عدل و انصاف کی گواہی دو! یہی بات سورۃ النساء (آیت ۱۳۵) میں بایں الفاظ فرمائی گئی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

کہ اے ایمان والو! عدل کے قیام کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کی گواہی دینے والے بنو!

پھر یہ گواہی صرف دنیا تک ہی محدود نہیں ہے' بلکہ آخرت میں بھی امتِ مسلمہ کو پوری نوعِ انسانی پر اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت پر یہ گواہی دینا ہو گی۔ سورۃ النساء (آیت ۴۱) میں فرمایا گیا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؕ

"پس (غور کرو کہ) اُس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے محمدؐ) ان لوگوں پر ہم آپؐ کو بحیثیت گواہ کھڑا کریں گے"۔

یعنی ہر امت اور ہر قوم کے نبی اور وہ لوگ کہ جنہوں نے دنیا میں حق کی گواہی دی ہو گی وہ محاسبۂ اخروی کے وقت کھڑے کئے جائیں گے تو وہ گواہِ استغاثہ (Prosecution

Witness) کی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ وہاں اللہ کی عدالت میں وہ گواہی دیں گے اور اس بات کو Testify کریں گے کہ اے پروردگار' تیری جو ہدایت ہم تک پہنچی تھی وہ ہم نے کسی کی بیشی کے بغیر' کسی چیز کو چھپائے بغیر' کسی مصلحت کا لحاظ کئے بغیر' اپنے کسی مفاد اور اپنے جسم و جان کے تحفظ کا خیال رکھے بغیر ان تک پہنچا دی اور اس طرح اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی بلا کم وکاست دے دی اور اس گواہی کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ پھر یہی شہادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر دیں گے۔ اس کے بعد پھر افراد کا عمومی محاسبہ ہو گا۔ لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ جو حق تم تک پہنچا دیا گیا تھا' حق کی جو تبلیغ تم تک کر دی گئی تھی اس کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ رہا؟

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء و رُسل کے لئے "شاہد" اور "شہید" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ المزّمل میں فرمایا گیا:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ○ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ○ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ○ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ○

"(اے لوگو! ہوشیار ہو جاؤ' آگاہ ہو جاؤ) بیشک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیج دیا ہے' جیسے کہ ہم نے فرعون کی طرف (حضرت موسیٰؑ کو) رسول (اور گواہ بنا کر) بھیجا تھا۔ پس فرعون نے (ہمارے) رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے (اسی دنیا میں) اس پر گرفت کی وبال کی گرفت۔ پھر تم کیونکر بچ جاؤ گے اگر تم نے (ہمارے رسول کا) انکار کیا؟ (اور تم کیسے بچو گے) اُس دن سے جو (خوف کے مارے) بچوں کو بوڑھا کر دے گا' اُس دن آسمان پھٹ جائے گا۔ بے شک اللہ کا وعدہ ضرور پورا ہونے والا ہے"۔

سورۃ الاحزاب میں جہاں نبی کریمؐ کی صفات اور ان کا مشن بیان فرمایا گیا تو آپؐ کی اسی صفتِ شہادت کو دوسری صفات و اوصاف سے مقدم کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ○ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ○

"اے نبیؐ" بے شک ہم نے آپ کو بھیجا شاہد' مبشراور نذیر (بنا کر) اور اللہ کی طرف دعوت دینے والا اس کے حکم سے' اور ایک روشن چراغ (بنا کر)"۔

تو یہ ہے ہمارے دین میں شہادت کا تصور' اور ہر نبی اسی شہادتِ حق کے لئے بھیجا جاتا تھا اور ہر رسول کی غایتِ بعثت یہی ہوتی تھی۔

شہادتِ حق کا ختمِ نبوت سے تعلق

محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کی تکمیل اور اس سلسلہ کے خاتمہ کے بعد اب امتِ محمد (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) اجتماعی حیثیت سے پوری نوعِ انسانی کے لئے گواہ بنا کر کھڑی کی گئی ہے۔ اب اس کی ذمہ داری ہے کہ اللہ کے دین کی شہادت قولاً اور عملاً' اجتماعی اور انفرادی سطح پر پیش کرے۔ اور یہی درحقیقت اس امت کی غرضِ تاسیس ہے۔ اسی مقصد کے لئے یہ امت برپا کی گئی ہے' اسے اللہ کی طرف سے اس کام کے لئے چُن لیا گیا ہے' اور بحیثیتِ جماعت یہی اس کا میمورنڈم ہے۔ اس امت کو دنیا کی دوسری اقوام و امم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا' وہ اپنے لئے جیتی ہیں' لیکن اسے ان کے لئے جینا ہے' ان کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا ہے اور ان کے سامنے حق کی شہادت کو پیش کرنا ہے۔

امّتِ مجتبٰی

سورہ البقرہ کی آیت زیرِ درس کے علاوہ سورۃ الحج کی آخری آیت میں بھی امتِ مسلمہ کی غرضِ تأسیس اور اس کا مقصدِ وجود فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی قرار دیا گیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا: **هُوَ اجْتَبٰكُمْ** "اس نے تمہیں (اس مقصد کے لئے) چن لیا ہے"۔ سورۃ الحج کا آخری رکوع ہمارے مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ارسالِ وحی اور انسانوں تک اپنے پیغام کی تبلیغ کے لئے ملائکہ اور انسانوں میں سے بعض کو منتخب فرما لیتا ہے (**اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ**) اسی مقامِ اصطفائیت پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فائز ہیں' چنانچہ آپؐ کا ایک لقب "مصطفیٰؐ" بھی ہے۔ پھر اس فریضہ شہادتِ حق کی

اہمیت مسلمانوں پر واضح کرنے کے لئے ایک دوسرا انداز اور اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا:

وَ جَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ○

سورۃ الحج کی اس آیۂ مبارکہ کا چونکہ "شہادتِ حق" یا "شہادت علی الناس" کے موضوع سے گہرا تعلق ہے' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ ہم اس آیۂ کریمہ کا بھی قدرے تشریح و تفصیل کے ساتھ مطالعہ کر لیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بات جان لیجئے کہ اس آیت میں "وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ" سے "وَ فِيْ هٰذَا" تک ایک جملہ معترضہ ہے' جو اکثر سلسلۂ کلام کے درمیان میں آ جایا کرتا ہے۔ ربطِ مضمون کے اعتبار سے "هُوَ اجْتَبٰكُمْ" کا براہِ راست تعلق "لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ......" سے جڑتا ہے۔ یعنی تمہیں اس نے چُن لیا ہے' پسند فرما لیا ہے' تاکہ رسول تم پر گواہ بن جائیں اور تم بنی نوعِ انسان پر گواہ بن جاؤ!

اس آیۂ کریمہ کی تشریح و تفسیر سے قبل اس کا ایک رواں ترجمہ' بلکہ ایک ترجمانی ملاحظہ فرمائیں:

"اللہ کے کام میں (In the Cause of Allah) محنت کرو' کوشش کرو' جدوجہد اور کشاکش کرو' جیسا کہ اس کی جدوجہد کا حق ہے۔ اس نے تم کو (دوسری اُمم و اقوام کے مقابلہ میں اپنے کام کے لئے) چُن لیا ہے ——— اور اس نے تم پر (دین کے احکام میں) کسی قسم کی تنگی بھی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیمؑ کا طریقہ ہے۔ اس (اللہ) نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے (نزولِ قرآن سے) پہلے بھی اور اس آخری کتاب میں بھی ——— تاکہ رسول تم پر گواہ ہو جائیں اور تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ۔ (یعنی رسول اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت ادا فرما کر تم پر اتمامِ حجت فرما دیں اور تم اپنے قول و عمل سے تاقیامِ قیامت نوعِ انسانی پر شہادتِ حق ادا کر کے حجت قائم

کرتے رہو) پس تم لوگ (خصوصیت کے ساتھ) اقامتِ صلٰوۃ اور ادائیگیٔ زکوٰۃ کا نظام قائم رکھو اور اللہ کو (اس کی کتابِ حمید' قرآن مجید کے واسطہ سے' جو "حَبْلُ اللّٰہ" ہے) مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھو۔ وہی اللہ تمہارا کارساز اور حامی و ناصر ہے۔ (لہٰذا مخالفت اور مصائب و مشکلات سے ہراساں نہ ہو' تم کو حقیقی ضرر اور نقصان کوئی نہ پہنچا سکے گا۔) پس اللہ تعالٰی کیا ہی اچھا کارساز اور کیا ہی اچھا مددگار ہے!"

سورۃ الحج کی اس آخری آیت کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ یہ شہادتِ حق ہی کی ذمہ داری ہے جس کے لئے اللہ تعالٰی انسانوں میں سے کسی کو اپنا رسول منتخب کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے خاتم النبیین سید المرسلین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ مُصطفائیت پر فائز فرمائے گئے۔ اور آنحضورؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد شہادتِ حق کی یہ ذمہ داری تا قیامِ قیامت امتِ مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے۔

امتِ مجتبیٰ کی عظیم ذمہ داریاں

یہ امرِ مسلّم ہے کہ کوئی جس قدر عظیم اور ارفع مرتبے کا حامل ہوتا ہے اس کی ذمہ داری بھی اسی قدر رفیع و عظیم ہوتی ہے۔ چنانچہ امتِ مسلمہ کو مقام اجتبائیت پر فائز فرما کر اسے شہادتِ حق کی عظیم ذمہ داری کا حامل بنایا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں "فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ" کے الفاظ کے ساتھ یہ ذمہ داری امت کو منتقل فرمادی ـــــ یعنی "جو لوگ یہاں موجود ہیں اب ان کا فرض ہے کہ ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں"۔ لہٰذا اس فرمانِ نبویؐ کے مطابق نوعِ انسانی کے سامنے شہادتِ حق اور تبلیغ دینِ حق کی ذمہ داری کا بھاری بوجھ امتِ محمدؐ کے کاندھوں پر آگیا ہے اور امت کے ہر ہر فرد کو انفرادی طور پر اور امت کو بحیثیتِ مجموعی اجتماعی طور پر نوعِ انسانی کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق کی شہادت دینی ہے۔

شہادتِ حق کی یہ عظیم ذمہ داری ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم شعوری طور پر اس کی ادائیگی کے لئے کمربستہ ہوں' لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ نہ ذمہ داری

پہ کا شعور ہے اور نہ مسئولیت کا احساس۔ پھر اس کی ادائیگی کی فکر ہو تو کیسے ہو؟ ہم اس بات سے تو بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم "امتِ مرحومہ" سے تعلق رکھتے ہیں، ہمیں "امتِ وَسط" بنایا گیا ہے، ہمیں "خیرِ امت" کا لقب دیا گیا ہے، ہم سید المرسلین اور خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت میں شامل ہیں ---- اور امرِ واقعی کے طور پر یہ ہے بھی خوشی اور مسرت کا مقام ---- لیکن افسوس کہ ہم کو اس بات کا بالکل احساس نہیں ہے کہ اس امتِ وسط اور خیرِ امت میں شامل ہونے کے عز و شرف کے ساتھ ساتھ ہمارے کاندھوں پر کس قدر عظیم ذمہ داری کا بوجھ بھی آن پڑا ہے اور شہادتِ حق کی اس ذمہ داری کے بارے میں ہمارا احتساب ہو گا۔ بقیہ پوری نوعِ انسانی سے باز پرس بعد میں ہو گی، پہلے ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اس حق کو کس طرح ادا کیا؟ تم رسولِ امینؐ کے قائم مقام تھے، تم اللہ کی آخری کتابِ ہدایت کے حامل تھے، تم پہاڑی کا چراغ تھے اور زمین کے نمک تھے۔ تم نے اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دینے کے لئے کیا محنتیں کیں، کتنی جدوجہد کی اور کتنی توانائیاں کھپائیں؟ غلبۂ دینِ حق کی جدوجہد اور فریضۂ شہادتِ حق کی ادائیگی میں کتنا مال کھپایا؟ کیا ان سوالوں کا کوئی جواب ہمارے پاس ہے؟ کیا ہم بارگاہِ خداوندی میں اس کا کوئی عذر پیش کر سکیں گے؟ اور خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس محاسبہ سے ہم سب کو لازماً سابقہ پیش آ کر رہے گا!

حضورؐ کی حیاتِ طیّبہ میں شہادتِ حق کا مجاہدہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں اس فریضۂ شہادتِ حق کی ادائیگی کا انداز اور اس کی شان دیکھنے کے لئے آپؐ کا تیئیس سالہ دورِ نبوت نگاہوں کے سامنے لائیے تو معلوم ہو گا کہ اجرائے وحی اور منصبِ نبوت و رسالت پر فائز ہونے کے دن سے حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک حضورؐ کی ساری جدوجہد، کشمکش اور جہاد و قتال کا مرکز و محور یہی فریضۂ شہادتِ حق اور تبلیغِ حق رہا ہے۔ آپؐ کی ساری محنت و مشقت میں یہ احساسِ ذمہ داری غالب رہا ہے کہ لوگوں پر حق کی گواہی دینے اور حق کے پہنچانے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ آخرت کی جواب دہی کا یہ احساس اور شہادتِ حق اور تبلیغِ حق کی ذمہ داری کی یہ فکر حضورؐ کو ہمیشہ دامن گیر رہی۔ یہی احساس آپؐ کو مکہ کے کوچہ و بازار

میں لئے لئے پھرتا رہا۔ کبھی گالیوں کی بوچھاڑ کا سامنا ہوا تو کبھی پتھروں کی بارش کا' کہیں طنز و استہزاء کے تیر برسائے جا رہے ہیں تو کہیں طعن و تشنیع سے جگر چھلنی کیا جا رہا ہے' کہیں گلے میں پھندا ڈال کر جان لینے کی کوشش کی جاتی ہے تو کبھی حالتِ سجدہ میں پشت اور شانہ مبارک پر نجاست بھری اوجھڑی لادی جا رہی ہے۔ راستے میں کانٹے بچھائے جا رہے ہیں۔ آپؐ کی آنکھوں کے سامنے آپؐ کے جاں نثاروں کو کہیں تپتی دھوپ میں منہ کے بل گھسیٹا جا رہا ہے' کہیں ان کے سینوں پر آگ دھکائی جا رہی ہے اور کہیں ان کو برچھیوں سے چھیدا جا رہا ہے۔ کبھی آپؐ اور آپؐ کے خاندان کو شعب ابی طالب میں محصور کر کے بھوک اور پیاس سے تڑپا کر مار ڈالنے کے منصوبہ پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اور پھر یومِ طائف کی سختی کا اندازہ کیجئے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بقول آپؐ کی زندگی میں اس سے زیادہ سخت دن کوئی نہیں گذرا۔ طائف کی گلیوں میں اوباش لڑکے پیچھے لگا دیئے گئے ہیں' تمسخر اڑایا جا رہا ہے' پھبتیاں کسی جا رہی ہیں' پتھروں کی بارش سے جسمِ اطہر لہو لہان ہے' پائے مبارک میں نعلین اس مقدس خون سے جم گئے ہیں۔ پھر قتل کی تیاریاں ہیں' ہجرت ہے' جوارِ بیتُ اللہ سے جدائی کا مرحلہ ہے' غارِ ثور ہے۔ آگے چلیے' مدینہ منورہ میں یہودیوں اور منافقوں کی ریشہ دوانیاں ہیں' بدر و اُحد کے معرکے ہیں۔ میدانِ اُحد میں اپنے محبوب ساتھیوں کے تڑپتے لاشے ہیں' وہ لوگ جو دل سے پیارے تھے' نظروں کے سامنے خاک و خون میں غلطاں ہیں۔ حمزہؓ جیسے عزیز چچا' جان نثار رفیق اور دودھ شریک بھائی کا چبایا ہوا جگر اور مثلہ شدہ جسم نگاہوں کے سامنے ہے۔ مصعب بن عمیرؓ کا لاشہ سامنے لایا جاتا ہے جس کو کفن تک میسر نہیں آ رہا اور اسے ایک چھوٹی سی چادر میں اس طرح لحد میں اتارا جاتا ہے کہ پاؤں گھاس سے ڈھانپے جاتے ہیں --- یہ وہ صالح نوجوان ہے کہ اسلام سے قبل مکہ میں اس سے زیادہ خوبصورت' معطر اور قیمتی لباس پہننے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اور یہی وہ جاں نثار صحابی ہیں جنہیں آنحضورؐ نے بیعتِ عقبۂ اولیٰ کے بعد قرآن کی تعلیم و تدریس کے لئے مدینہ منورہ بھیج دیا تھا اور ان کی تبلیغ سے وہ میدان تیار ہوا جس کے نتیجے میں یثرب کو دارالہجرت اور مدینۃ النبیؐ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ --- اسی معرکۂ اُحد میں خود رسول اللہؐ کے دندانِ مبارک شہیدؓ ہوئے' خَود کی کڑیاں رخسارِ مبارک میں اور سرِ مبارک میں پیوست ہوئیں' بے ہوشی کی

کیفیت بھی طاری ہوئی۔

غور کیجئے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ کس لئے ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ ایک طرف فریضۂ "شہادتِ حق" کی ذمہ داری کا احساس تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مراحل سے گزار رہا تھا اور دوسری طرف امتِ محمد علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے لئے آنحضورؐ کا اسوۂ حسنہ نمونہ بننا تھا اور اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو ان تمام مراحل سے اسی لئے گزار رہا تھا کہ آپؐ کے نام لیواؤں اور آپؐ سے عقیدت و محبت کے تمام مدعیان کو معلوم ہو جائے کہ خیرِ امت اور امتِ وسط ہونے کا منصب جہاں ایک مقامِ عزو شرف ہے، وہاں اس مقامِ رفیع کی بڑی کٹھن اور بھاری ذمہ داریاں ہیں، جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے ہوئے انجام دینا ہوگا، جس کے بغیر محاسبۂ اُخروی سے رستگاری ممکن نہیں۔

فریضۂ شہادتِ حق کی امت کی طرف منتقلی

سورۃ البقرہ کی زیرِ مطالعہ آیت اور سورۃ الحج کی آخری آیتِ کریمہ اس بات کے لئے نصِ قطعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد بنی نوعِ انسانی کے سامنے حق کی شہادت دینا امتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے اور اسی شہادتِ حق ہی کے لئے یہ امت برپا کی گئی ہے۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کا بھی یہ لازمی تقاضا ہے کہ دنیا کی رشد و ہدایت کا کام امت سرانجام دے اور اپنے قول و فعل سے گواہی دے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ذمہ داری جس طور پر امت کی طرف منتقل فرمائی اس کا حوالہ اسی مضمون میں گزر چکا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ خطبہ حجۃ الوداع کے حوالے سے اس بات کی مزید وضاحت کروں کہ حضورؐ نے فریضۂ شہادتِ حق کی امت کی طرف منتقلی کا کام کس کمالِ حکمت سے انجام دیا۔ خطبۂ حجۃ الوداع کو بجا طور پر حقوقِ انسانی کا ایک منشور اور ہدایتِ ربانی کا ایک خلاصہ کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سال کی مسلسل محنتِ شاقہ اور جاں گسل مساعی کے بعد جب وہ وقت آیا کہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک فریضۂ شہادت علی الناس کی تکمیل ہوگئی اور اللہ کا دین بتمام و کمال غالب ہوگیا تو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عظیم اجتماع سے خطاب فرمایا۔ اس خطاب میں آپؐ نے انتہائی اہم ہدایات ارشاد فرمانے کے بعد مجمع سے سوال کیا: **اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟** کہ لوگو! میں نے خدا کا پیغام ' اس کی ہدایت پہنچا دی کہ نہیں ؟ تبلیغ کا حق ادا ہوگیا کہ نہیں؟ اس پر سوا لاکھ صحابہ کرامؓ کا مجمع پکار اٹھا: **فَانَشْهَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغتَ وَاَدَّيْتَ وَ نَصَحْتَ** کہ اے اللہ کے رسولؐ! ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حقِ تبلیغ ادا کردیا ' حقِ امانت ادا کردیا اور حقِ خیر خواہی ادا کردیا۔ آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ دریافت فرمائی اور صحابہ کرامؓ نے ہربار یہی جواب دیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے انگشتِ مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے فرمایا: **اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ** کہ اے پروردگار! تو بھی گواہ رہ ' میں سبکدوش ہوگیا' میری ذمہ داری پوری ہوئی ! میری طرف سے فریضۂ شہادت علی الناس ادا ہوگیا اور تیرا دین بالفعل قائم ہوگیا!

اس سوال و جواب کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادتِ حق اور تبلیغِ دین کی وہ ذمہ داری جو خاتم النبیین والمرسلین کی حیثیت سے آپؐ کے سپرد تھی صحابہ کرامؓ سے بایں الفاظ مخاطب ہو کر امت کی طرف منتقل فرمادی کہ **فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ** یعنی جو لوگ یہاں موجود ہیں اب یہ ان کا فرض ہے کہ وہ ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں! اس طرح فریضۂ شہادتِ حق کی ادائیگی کی ذمہ داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں سے امت کے کاندھوں پر منتقل ہوگئی۔ اب امت کے ہر فرد کو انفرادی طور پر اور امت کو اجتماعی طور پر یہ فریضہ سرانجام دینا ہے۔

عملی جدوجہد کا نقطۂ آغاز

سورۃ الحج کی آخری آیت میں امت کا فرضِ منصبی شہادت علی الناس' بیان فرمانے کے فوراً بعد امر کے صیغہ میں امت کو تین احکام دیئے گئے: (۱) **فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ** (۲) **وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ** (۳) **وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ**۔۔۔ ان کے آغاز میں کلمہ **"فَ"** (بمعنی "پس") بہت معنی خیز ہے۔ فرمایا: (۱) پس نماز قائم کرو ' (۲) زکوٰۃ ادا کرو' اور (۳) اللہ سے چمٹ جاؤ! اس کے دامن کو مضبوطی سے تھام لو! اس آخری حکم "اِعتصام باللہ" کے بارے میں تو بعد میں کچھ عرض کیا جائے گا' پہلے ہم اِقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ ایک انسان کو جب اس کے نصب العین یا ہدف (Target) کا شعور حاصل ہو جائے اور اس کی منزل متعین ہو جائے کہ اسے کہاں پہنچنا ہے تو وہ یکدم ایک ہی جست میں اس ہدف تک نہیں پہنچ سکتا' بلکہ سب سے پہلے اسے اپنے سفر کا نقطۂ آغاز متعین کرنا ہو گا اور پھر منزل بہ منزل اپنے منتہائے مقصود تک پہنچنا ہو گا۔ چنانچہ "فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ" کے الفاظ میں اس جدوجہد کا نقطۂ آغاز بیان فرمایا جا رہا ہے کہ "شہادت علی الناس" کے ہدف تک پہنچنے کے لئے سفر کا آغاز اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ہو گا۔ یہ گویا اس ہدف کے ناگزیر لوازم (Pre-requisites) ہیں۔ وہ شخص بڑا ہی نادان ہے جو شہادتِ حق اور اس سے بھی بڑھ کر اقامتِ دین کے مراحل میں ایک زور دار چھلانگ لگا کر پہنچنا چاہے جب کہ اسے نہ اقامتِ صلوٰۃ کی کوئی فکر ہو اور نہ ادائے زکوٰۃ کی' نہ تو اس کی نماز ہی درست ہو اور نہ ہی اسے زکوٰۃ کے احکام تک معلوم ہوں۔

ہماری بہت سی نادانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فی زمانہ جن لوگوں کو اللہ نے اپنے دین کا کچھ فہم عطا فرمایا ہے اور جن کو یہ شعور حاصل ہو گیا ہے کہ اسلام محض چند مراسمِ عبودیت ہی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے' ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ دین میں کام کی جو تدریج ہے وہ ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور یہ لوگ جوشِ عمل میں اگلی منزل پر چھلانگ لگانے کی سعی لا حاصل میں لگ جاتے ہیں' جس کا نتیجہ چاروں شانے چت گرنے کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ قرآن حکیم سے ہمیں یہ راہنمائی حاصل ہو رہی ہے کہ شہادت علی الناس کی منزل کی طرف پیش قدمی کے لئے پہلے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ جیسے فرائض سے تمسک ضروری ہے' اس کے بغیر نہ سیرت کی تعمیر ہو گی اور نہ دعوت و تبلیغ کا حق ادا ہو گا۔ شریعتِ حقّہ میں شخصیت اور معاشرے کی اصلاح کے لئے جو دائرے مقرر کر دیئے گئے ہیں' ان کا لحاظ کئے بغیر آخری دائرے میں جست لگا دینا مفیدِ مطلب نہیں بلکہ مضر ثابت ہوتا ہے' کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ نظامِ باطل کے خاتمے اور اسلام کے نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لئے شاندار جلسے جلوس اور منظم مظاہرے صرف اسی وقت مفید ثابت ہو سکتے ہیں جب کہ ان میں حصہ لینے والے "فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ" پر عامل ہوں۔

اس کے بغیر یہ جلسے جلوس' فلک شگاف نعرے اور مظاہرے گھاٹے کے سودے ہیں اور ان کی حیثیت فریبِ نفس سے زیادہ نہیں' بلکہ اندیشہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زبردست گرفت اور محاسبے کا باعث بن جائیں۔

اسی طرح جو لوگ بس نماز اور زکوٰۃ ہی کو پورا دین سمجھ بیٹھیں' روزوں کی پابندی' حج کی ادائیگی اور کچھ اوراد و وظائف پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں' جب کہ ان کی زندگی کے دوسرے معاملات اللہ کی اطاعت سے خالی ہوں' نہ دین کی مغلوبیت ان میں کوئی غیرت و حمیت پیدا کرے اور نہ جہاد و قتال کی منازل ان کے سامنے ہوں تو جان لیجئے کہ وہ بھی سخت مغالطے میں ہیں' کیونکہ ان کا تصورِ دین محدود ہی نہیں مسخ شدہ بھی ہے۔

"اعتصام باللہ" کا حکم: اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے احکام کے بعد تیسرا حکم ہے: "**وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ**" یعنی اللہ سے مضبوطی کے ساتھ چمٹ جاؤ! اس کا دامن مضبوطی سے تھام لو! لفظ 'عصمت' حفاظت کے معنی میں آتا ہے اور "اعتصام" کا مفہوم اپنی حفاظت کے لئے کسی چیز کے ساتھ چمٹ جانا یا کسی کا دامن تھام لینا ہے۔ یہاں "**وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ**" کے الفاظ سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ سے چمٹ جانے کا جو حکم یہاں دیا جا رہا ہے اس کا مفہوم کیا ہے' اللہ سے چمٹ جانے کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ "**القرآنُ یُفسّر بعضُہ بعضًا**" کے اصول کے پیشِ نظر ہمیں اس کی وضاحت سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں ملتی ہے' جہاں فرمایا گیا: "**وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ**" یعنی اللہ کی رسی کے ساتھ چمٹ جاؤ! حبلُ اللہ کو مضبوطی سے تھام لو! اب "**حَبلُ اللّٰہ**" کے مفہوم کی تعیین کے لئے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں' کیونکہ قرآن کی تبیین و تشریح اور اس کی وضاحت حضورؐ کے ذمہ تھی۔ چنانچہ ایک طویل حدیث کے مطابق جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی عظمت و رفعت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "**ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ**" کہ یہ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے۔ چنانچہ "**وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ**" کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن حکیم کو مضبوطی سے تھامو' اس سے اپنا مضبوط تعلق استوار کرو!

خطبہ حجتہ الوداع کے متعلق صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے شہادت لینے اور "**فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ**" کا حکم دینے سے پہلے جو آخری بات فرمائی وہ یہ ہے:

وَ قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ ' إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ ' كِتَابُ اللهِ

"اور یقیناً میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ جس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رہو گے اس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔ وہ چیز ہے کتابُ اللہ!"

پس عبادتِ رب' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین جیسے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمارے دست و بازو صلوٰۃ اور زکوٰۃ ہیں اور اس سفر میں ہمارے لئے زادِ راہ' مشعلِ راہ اور ہادی و رہنما اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن حکیم ہے' جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: **ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ!**

فریضۂ شہادت علی النّاس اور صحابۂ کرامؓ کا کردار

اس فریضۂ شہادت علی الناس کی انجام دہی میں حضورؐ کے جاں نثار صحابہ کرامؓ نے جو مصائب و شدائد جھیلے' جو ایثار و قربانی پیش کی اور جو محنتیں اور مشقتیں برداشت کیں وہ تاریخِ انسانی کا ایک درخشاں باب ہے۔ تاریخِ عالم ان کے صبر و مصابرت اور عزیمت و استقامت کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے اور قیامت تک عاجز رہے گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے خلافتِ راشدہ کی صورت میں اسلام کا جو نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کیا وہ انسانیت کی معراج ہے۔ اگرچہ وہ نظامِ خیر و صلاح و فلاح اس وقت اپنی حقیقی شکل و صورت میں دنیا میں عملاً کہیں موجود نہیں ہے' لیکن میں بلا خوفِ تردید عرض کرتا ہوں کہ آج بھی دنیا میں جو خیر' بھلائی اور خوبی کہیں نظر آتی ہے اور جو انسانی اقدار موجود ہیں یا قیامت تک موجود رہیں گی وہ اسی صالح نظام کی برکات ہیں۔ اسی نظام نے انسان کو اس کے حقوق و فرائض کا شعور بخشا' اسی نظام کی بدولت رنگ و نسل اور زبان و وطن کے امتیازات ختم ہوئے' اسی نظام نے خواتین کو معاشرے میں ان کا جائز مقام دیا اور ان کے حقوق دلوائے۔ یہی وجہ ہے کہ "**الفضل ماشهدت به الاعداء**" کے

مصداق دشمن بھی اس نظامِ عدل و قسط کی برکات کے معترف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ آنجہانی گاندھی نے ۱۹۳۷ء میں وزارتوں کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ اپنی حکومت کے لئے صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے دورِ حکومت کو بطور نمونہ سامنے رکھا جائے۔

دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کی صورت میں حق کی عملی شہادت سینۂ گیتی پر قائم کر دی گئی جو انسانیت کے لئے تا قیامِ قیامت مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب امت کو قولی شہادت کے ساتھ ساتھ یہی عملی شہادت دنیا کے سامنے پھر پیش کرنا ہے' اس لئے کہ عملی شہادت قائم کئے بغیر شہادت علی الناس کا فریضہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ دنیا پہلے عمل کو دیکھتی ہے لہٰذا نبوی منہاج پر استوار نظام کی اقامت امت پر فرض ہے۔ اب اگر امت اس فرض سے بحسن و خوبی عہدہ برآ نہیں ہوتی تو وہ لازماً خدا کے ہاں مسئول ہو گی' ازروئے فرمان خداوندی:
فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (الاعراف: ۶) —————— "ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی!"

لمحۂ فکریہ

شہادت علی الناس کے اس فریضہ کی ادائیگی کے ضمن میں اب ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ آج ہمارا کیا حال ہے؟ کیا ہم اس فرض کی انجام دہی کا کوئی احساس رکھتے ہیں؟ کیا ہمیں بحیثیتِ امت یہ شعور حاصل ہے کہ ہمارے کاندھوں پر کس قدر عظیم ذمہ داری کا بار ہے؟ کیا ہمیں بنی نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت کے لئے قولی و عملی شہادت کی کوئی فکر ہے؟ اور اس سے بڑھ کر غور طلب بات یہ کہ دوسروں پر حق کی شہادت قائم کرنے سے پہلے کیا ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی ایک گوشے سے بھی اس حق کی کوئی عملی شہادت دی جا رہی ہے؟ یہ بڑی ہی دردناک' المناک اور تلخ حقیقت ہے کہ ہماری موجودہ حیثیت خزانے کے سانپ کی سی ہے کہ ہم نہ تو خود اس دولتِ ربانی سے مستفیض ہو رہے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کا موقع دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے سوءِ عمل اور پستیٔ کردار کی وجہ سے دنیا میں ذلت و مسکنت کی جو حسرت انگیز اور عبرت آموز تصویر

بنے ہوئے ہیں اسے دیکھ کر اسلام کی حقانیت پر کوئی ایمان لائے تو کیسے لائے؟ یہ بڑی ہی تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہم شہادتِ حق کا فریضہ سرانجام دینے کے بجائے کتمانِ حق کے مجرم بنے ہوئے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں بنی اسرائیل کو' جو ہم سے پہلے "امتِ مسلمہ" کے مقام پر فائز تھے' ذلت و مسکنت کے عذاب سے دوچار کیا گیا تھا اور ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا۔ آج یہی سزا ہمیں مل رہی ہے اور ہم پر تنبیہات کے کوڑے مختلف عذابوں کی شکل میں برس رہے ہیں' لیکن حیف کہ ہماری نگاہوں سے غفلت کے پردے نہیں چھٹ رہے اور ہم خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کو تیار نہیں۔

یہ ایک فطری قانون ہے' جس سے ہمیں اپنی روز مرہ زندگی میں واسطہ پڑتا رہتا ہے کہ کوئی چیز جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہو وہ اگر اس مقصد کو پورا نہ کرے تو اسے اٹھا کر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے' ایسی چیزوں کو سنبھال کر نہیں رکھا جاتا۔ مثال کے طور پر قلم لکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے' لیکن جب آپ کا قلم لکھنا بند کر دے اور اس سے اس کا اصل مقصد ہی حاصل نہ ہو رہا ہو تو آپ یقیناً اسے اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیں گے۔ امتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ امتِ مسلمہ کی تاسیس دنیا میں اس مقصد کے لئے کی جاتی ہے کہ وہ عبادتِ رب کا رویہ اختیار کرے اور شہادتِ حق کا فریضہ انجام دے۔ اب اگر امتِ مسلمہ اپنے مقصدِ وجود اور غرضِ تاسیس ہی کو پورا نہ کرے تو اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی' وہ راندۂ درگاہ بن جاتی ہے' وہ مردودِ بارگاہِ خداوندی ہو جاتی ہے' اسے دھتکار دیا جاتا ہے اور اس پر خدا کی لعنت اور پھٹکار پڑتی ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال یہود ہیں' جن کے بارے میں فرمایا گیا: **ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ** "اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے"۔

یہود کو اللہ تعالیٰ کے اسی ضابطے کے تحت اس قدر اہانت آمیز سزا ملی' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے انتہائی پیارے تھے۔ قرآن حکیم کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ کی طرف سے جتنا لاڈ پیار اس امت کے ساتھ ہوا وہ کسی دوسری امت کے ساتھ نہیں ہوا۔ اللہ نے ان کے لئے صحرا میں بادلوں کا سائبان فراہم فرمایا' ایک چٹان سے بارہ چشمے جاری فرما دیئے' آسمان سے من و سلویٰ نازل فرمایا' فرعون جیسے جابر

بادشاہ سے اس معجزانہ شان کے ساتھ گلو خلاصی کرائی کہ عصائے موسوی کی ضرب سے سمندر نے ان کو راستہ دے دیا اور پانی چٹانوں کی طرح اطراف میں کھڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے انہی احسانات و انعامات کی بناپر ان کو یہ غرّا پیدا ہو گیا تھا کہ نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ کہ ہم تو اللہ کے بڑے چہیتے ہیں اور اس کی اولاد کی مانند ہیں! یہ وہ قوم تھی کہ جس میں سینکڑوں نبی تشریف لائے اور بیک وقت کئی کئی نبی موجود رہے (مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی مبعوث فرمایا گیا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کی حیثیت سلسلۂ بنی اسرائیل کے خاتم النبیین کی ہے' ان کی نبوت کے وقت حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام موجود تھے۔) جس قوم میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام جیسے جلیل القدر نبی اور عظیم الشان بادشاہ گزرے' جس قوم کو مسلسل نبوت عطا کی گئی' جس قوم کے لئے شریعت نازل کی گئی اور کئی کتابیں اتاری گئیں ' جنہیں تورات کے بعد کتنے ہی صحیفے دیئے گئے' زبور جیسی کتاب عطا کی گئی اور جن کے لئے انجیل جیسی پُر حکمت کتاب نازل کی گئی ــــــ لیکن دیکھ لیجئے کہ اس سب کے باوجود انہیں اللہ کی نافرمانی کی کیسی کڑی سزا دی گئی۔

بدقسمتی سے آج یہی مغالطہ ہمیں لاحق ہے کہ ہم امتِ مرحومہ میں شامل ہیں' اللہ کے محبوب نبیؐ کے محبوب امتی ہیں۔ لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ خدا کے ساتھ اگر ہمارا کوئی رشتہ ہے تو اس مقصد کے واسطے سے ہے جس کے تحت ہمیں امّتِ وَسَط اور خیرِ امت کے خطابات سے نوازا گیا ہے۔ ان خطابات سے عُجب پیدا نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ بہت بڑی ذمہ داریوں کے متقاضی ہیں۔ اگر ہم ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کریں گے' اور اپنے مقصدِ وجود کو پورا کرنے کی جدوجہد نہیں کریں گے تو ضابطۂ خداوندی کے مطابق خس و خاشاک کی طرح بہا دیئے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ پورا ہو رہا ہے۔ جب تک ہم بحیثیتِ امت اپنے فرضِ منصبی کو پورا کرنے کی جہد و کوشش کرتے رہے ہم دنیا میں سربلند رہے اور دنیا نے ہماری عظمت و سطوت کا لوہا مانا اور جب سے ہم نے اپنے اس فرض کو پسِ پشت ڈالا ہم زوال پذیر ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ ہمارے تنزل کو صدیاں بیت گئی ہیں۔ اندلس میں جہاں ہم نے سات سو سال سے زائد تک حکومت کی' ہمارا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ سمرقند' تاشقند اور بخارا جہاں سے حدیث اور فقہ کے بڑے بڑے

ائمہ اٹھے ' آج وہ شہر منکرینِ خدا کے قبضہ میں ہیں اور وہاں پر قائم بڑی بڑی مساجد اور درسگاہیں ' سیرگاہوں اور یادگاروں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مقہور و مغضوب قوم کے ہاتھوں مشرقِ وسطیٰ میں عربوں کو جس ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا وہ عذاب کا ایک کوڑا ہی تو تھا' جس کے نتیجے میں ہمارا قبلۂ اول جو فاروقِ اعظمؓ سے لے کر ۱۹۶۷ء تک ہماری تولیت میں تھا' یہودیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ (اس عرصے میں قریباً ایک صدی مستثنیٰ ہے جس میں بیت المقدس عیسائیوں کی تحویل میں چلا گیا تھا) لیکن یہ سانحہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے ناکافی رہا اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک اسی طرح عیش کوشی ' دنیا طلبی اور خدا سے بغاوت کی روش پر کمربستہ ہیں جو صدیوں سے ہماری فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔

خود ملک خداداد پاکستان کا حال دیکھ لیجئے جو ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا' لیکن اسلام سے اعراض کے نتیجے میں ہمارا جو حال ہوا ہے اسے ہم نے نگاہِ عبرت سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہندوستان میں' جہاں ہم ایک ہزار سال تک حکمران رہے' ہم کس طرح پامال کئے گئے اور اب تک کئے جا رہے ہیں۔ ہندو کے ہاتھوں شکست اور اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کا سقوط ہماری تاریخ کا المناک ترین باب ہے۔ وہاں کشت و خون کا جو بازار گرم ہوا اور بھائیوں کے ہاتھوں بھائیوں پر بہیمانہ مظالم کے جو پہاڑ توڑے گئے اور بھائیوں کی شقاوتِ قلبی کا یہ مظاہرہ کہ ان کی ہوس کے ہاتھوں بہنوں کی عصمت کے آبگینے چکنا چور ہوئے --- کیا یہ سب کچھ ہمارے لئے کسی درجہ میں عبرت اور انذار کا باعث بنا ؟ کیا ہمارے دل میں رُجوع الی اللہ کی تحریک پیدا ہوئی؟ کیا توبۃ النصوح کا جذبہ ہمارے دل میں ابھرا؟ کیا ہمیں اپنی حالت کو بدلنے کا احساس ہوا؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور ہمارے لیل و نہار جو پہلے تھے وہی اب بھی ہیں۔ اس بچے کھچے پاکستان میں جو فتنے اور عصبیتیں عفریتوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں وہ بھی ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار نہیں کر سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں ذلت و رسوائی کا سب سے بڑا نشان مسلمان بن گئے ہیں۔ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ ہماری پیٹھوں پر عذابِ الٰہی کے کوڑے پڑ رہے ہیں اور یہ سب کچھ خدا کے قانون اور ضابطے کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اس صورتِ حال میں

اس وقت تک ہرگز کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی جب تک ہم خود اپنے رویے کو نہیں بدلیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ضابطہ ہے کہ : **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَابِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَابِاَنۡفُسِہِمۡ**۔ "یقیناً اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا' جب تک وہ اپنی حالت کو خود نہ بدلے"۔ چنانچہ جب تک ہم اپنے رویے کو تبدیل نہیں کریں گے اور بحیثیتِ امت اپنے ان فرائضِ منصبی کا خیال نہیں رکھیں گے جن کے لئے ہمیں امتِ مسلمہ بنایا گیا ہم اسی صورتحال سے دوچار رہیں گے۔ لہٰذا ہم میں سے ایک ایک فرد کو شعوری طور پر یہ طے کرلینا چاہئے کہ اس کا مقصدِ زندگی عبادتِ ربّ اور شہادت علی الناس کے فریضہ کی ادائیگی ہے اور یہ مقصد تمام مفادات سے بلند و بالا اور سب پر حاوی ہو گا اور سب سے مقدم رہے گا اور "**اِنَّ صَلٰوتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ**" کے مصداق اس کا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لئے ہو گا۔ جب تک امت کے ہر فرد کی صلاحیتیں ' توانائیاں اور تمامتر جدوجہد اس ایک نکتہ پر مرتکز نہیں ہو گی اس وقت تک یہ صورت حال نہیں بدلے گی۔ یہی سنت اللہ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا : **وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا** ○

اَقُولُ قَوۡلِی ھذا و استغفر اللّٰہَ لی و لکم و لسائر المسلمین و المسلمات

اقامتِ دین

سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ کی روشنی میں

دین کا تیسرا اہم تقاضا
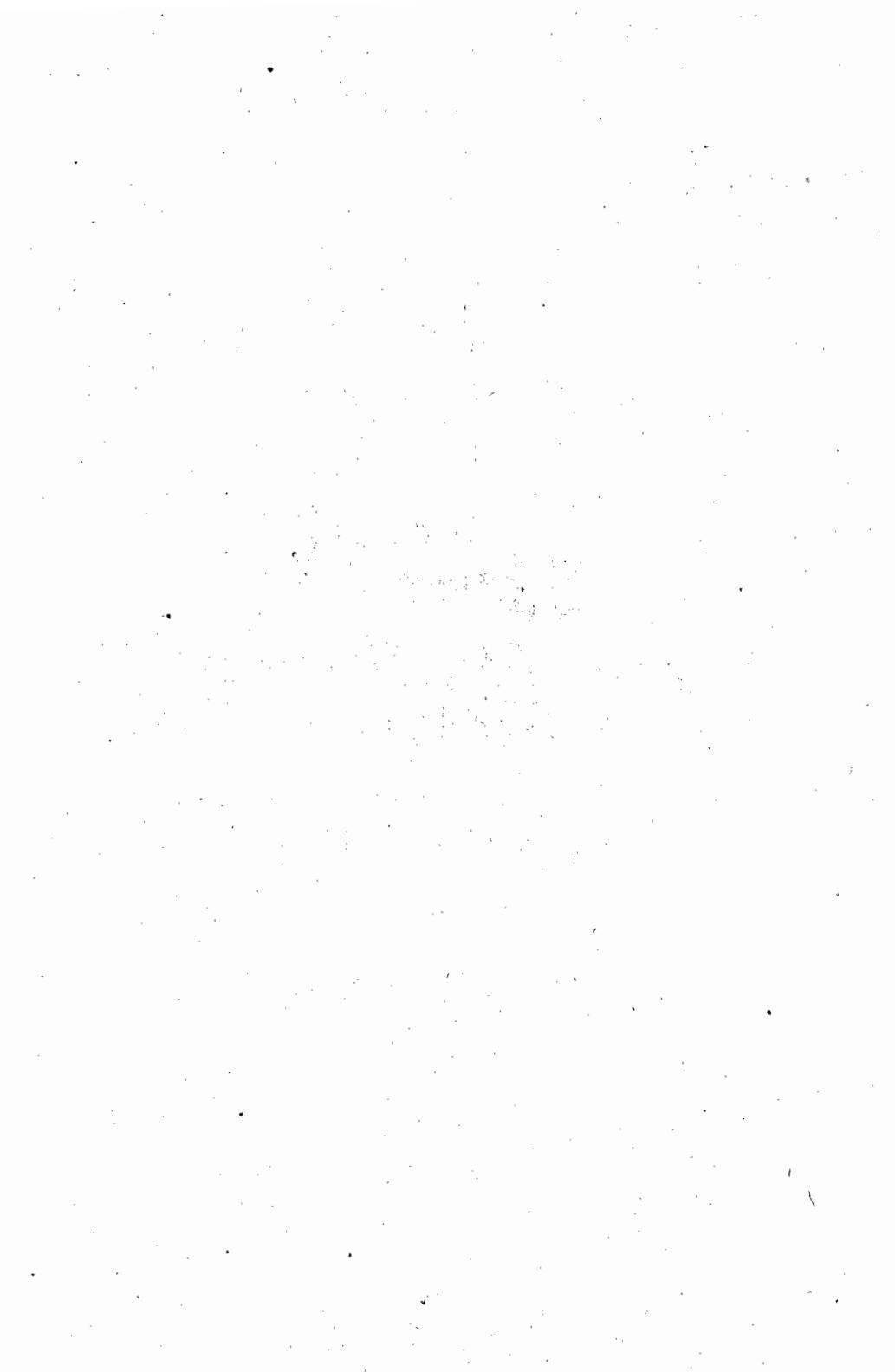
نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہِ الکریم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم - بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم ○

دعوتِ بندگیٔ رب اور فریضۂ شہادت علی النّاس کے بعد جو تیسری بڑی ذمہ داری اس امت کے سپرد کی گئی ہے اس کے لئے قرآنی اصطلاح "اقامتِ دین" ہے، یعنی دین کا قیام ' دین کا غلبہ ' دین کو بحیثیت نظامِ زندگی بالفعل قائم کردینا۔ اصلاً تو یہ نتیجہ ہے اسی "عبادتِ رب" کا ' جس سے گفتگو شروع ہوئی تھی ' یعنی عبادت کا نتیجہ "شہادتِ حق" یا "شہادت علی الناس" اور شہادتِ حق کی بلند ترین منزل "اقامتِ دین" ہے ' لیکن ان تینوں اصطلاحات کو علیحدہ علیحدہ ذہنوں میں محفوظ کرنا اس لئے ضروری ہوگیا ہے کہ فہمِ دین سے رفتہ رفتہ بُعد پیدا ہوجانے کی وجہ سے مجرد لفظ "عبادت" سے ذہن ان دوسری دو ذمہ داریوں تک نہیں پہنچتا جو حقیقت میں لازم و ملزوم ہیں۔ لہٰذا جب تک اس کے مضمرات کو کھول کر نہ بیان کردیا جائے کہ اس بیج میں یہ پورا درخت پنہاں ہے ' اس وقت تک ذہن اسی محدود تصورِ عبادت کی گرفت میں رہتا ہے کہ عبادتِ رب کا مقصد محض نماز ' روزہ ' حج اور زکوٰۃ ہے۔ اس محدود تصور سے رستگاری کے لئے ضروری ہے کہ ان تینوں اصطلاحات کو ملحوظ رکھا جائے جو درحقیقت ایک ہی نکتۂ ایمان کی تفسیریں ہیں! لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ "مطالباتِ دین" کے ضمن میں ان تین اصطلاحات کو ذہن نشین کر لیں کہ یہ تینوں چیزیں فرائضِ دینی میں شامل ہیں اور فلاحِ دنیوی اور نجاتِ اخروی کے لئے ناگزیر ہیں۔

اقامتِ دین کی گفتگو اصلاً تو ہمارے منتخب نصاب میں سورۃ الصّف کے درس کے ضمن میں آتی ہے ' جس کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تکمیلی مقصد یہ ہے کہ جو ہدایت و رہنمائی اور دینِ حق یعنی ضابطۂ حیات دے کر آپؐ بھیجے گئے تھے اسے آپؐ پوری زندگی کے نظامِ اطاعت پر غالب کردیں۔ چنانچہ وہاں فرمایا گیا: **هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ** کہ وہی ہے اللہ جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق دے کر

بھیجا ہے 'یعنی کتاب اور نظامِ شریعت دونوں دے کر' تاکہ آپؐ اس ہدایت اور دینِ حق کو ہر جنسِ دین پر غالب کر دیں! —

قابلِ غور بات

اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا قرآن کا نزول محض تلاوت کے لئے ہوا ہے؟ یہ صرف زبانی تعریف و توصیف (Lip Service) کے لئے آیا ہے یا محض ایصالِ ثواب کے لئے اتارا گیا ہے؟ نہیں —— بلکہ قرآن تو حضورؐ پر اس لئے نازل کیا گیا تھا تاکہ اس کے مطابق نظامِ زندگی بالفعل قائم ہو اور دنیا کے سامنے اللہ کے دین کا جامع اور کامل نمونہ آجائے۔ از روئے قرآن حکیم حضورؐ کی بعثت کا مقصد یہی تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیّبہ اسی جدّوجہد سے عبارت ہے۔ اور اسی کے لئے محنتیں کرنے' مشقتیں جھیلنے' جانیں کھپانے' قربانیاں دینے' مال خرچ کرنے' غرضیکہ اس راہ میں اپنے جسم و جان کی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں لگانے کا مطالبہ ان لوگوں سے بھی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں۔ لہٰذا سورۃ الصف میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ "اے ایمان والو! کیا میں تم کو اس تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تم کو عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ (وہ یہ کہ) اللہ اور اس کے رسولؐ پر پختہ یقین رکھو اور (اس کے دین کو غالب کرنے کے لئے) اس کی راہ میں جہاد اور مجاہدہ کی روش اختیار کرو۔ (اس کے لئے اپنی صلاحیتیں' توانائیاں' جانیں' مال و منال اور اپنے اوقات اللہ کی راہ میں کھپاؤ) یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو" (الصف: ۱۰-۱۱)

آج کی نشست میں اسی مضمون کی وضاحت کے لئے ہم سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ کا مطالعہ کریں گے۔ فرمایا:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖ

اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى ....

"(اے مسلمانو!) اُس (اللہ) نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے از جنسِ دین وہی جس کی وصیت کی تھی اس نے نوح کو' اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبی) تمہاری طرف اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو"

نوٹ کیجئے کہ "شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ" میں جمع مخاطب کی ضمیر استعمال ہوئی ہے' جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ اس آیت کی مخاطب ہر دَور اور ہر زمانے کی امتِ مسلمہ ہے' البتہ "وَالَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ" میں واحد مخاطب کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔

تمام انبیاء و رسل کا دین ایک ہے

اس آیۂ مبارکہ کے زیرِ مطالعہ جزو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کے لئے بطورِ دین وہی چیز مقرر کی ہے جو اس سے پہلے دیگر جلیل القدر انبیاء و رسل کے لئے مقرر کی تھی۔ آیت کے اس جزو سے ایک ضمنی مضمون یہ نکلتا ہے کہ یہاں جن پانچ انبیاء و رسل (نوح' ابراہیم' موسیٰ' اور عیسیٰ علیہم الصّلوٰة والسّلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا تذکرہ ہے' ان کا انبیاء و رسل کے مابین ایک خصوصی مقام و مرتبہ ہے۔ قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے "اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ" (رسولوں میں ایک خاص مرتبہ والے' مقامِ عزیمت پر فائز رسول) اکثر و بیشتر علماء کا یہی خیال ہے کہ "اولوا العزم من الرسل" یہی پانچ رسول ہیں۔ بعض علماء اس فہرست میں حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کو بھی شامل کرتے ہیں' لیکن علماءِ سلف کی اکثریت کا رجحان انہی پانچ رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے۔ گروہِ انبیاء و رسل میں یہ پانچ امتیازی شان کے حامل ہیں۔ ایک بات اس سے یہ بھی معلوم ہوئی کہ ان تمام انبیاء و رسل کا دین ایک ہی رہا ہے۔ جو دین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی دین حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' اور حضرت عیسیٰ سلام اللہ علیہم کا تھا۔

لفظ "دین" کا مفہوم

آگے بڑھنے سے پہلے لفظ "دین" کے معانی و مفاہیم کو اچھی طرح جان لینا اور سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ لفظ بھی "عبادت" اور "شہادت" کے الفاظ کی طرح تعلیماتِ اسلامی میں بڑا اہم اور مرکزی لفظ ہے اور اس کے صحیح اور حقیقی فہم پر ہی قرآن حکیم کی دعوت کا صحیح اور درست مطلب سمجھنا منحصر ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ "دین" کا اصل مفہوم جزا و سزا یا بدلہ ہے۔ چنانچہ سورۃ الفاتحہ میں یہ لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے: **مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ** ۝ (جزا و سزا، بدلے کے دن کا مالک!) اردو کا مشہور محاورہ ہے "جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے!" عربی میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے محاورہ بولا جاتا ہے "کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ "۔۔۔۔ اسی جزاء و سزا کے بنیادی تصور سے عربی زبان میں لفظ "دین" کے مفاہیم میں انتہائی وسعت پیدا ہوتی ہے اور غور کرنے سے یہ تمام مفاہیم اور وسعتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جزا و سزا کسی ضابطے اور قانون کے تحت ہی ہوتی ہے۔ یعنی ضابطے اور قانون کی پابندی اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے پر انسان جزاء کا مستحق ٹھہرتا ہے اور اس کی خلاف ورزی اور نافرمانی سے سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ لہٰذا اسی لفظ "دین" میں جزا و سزا اور بدلے کے ساتھ ساتھ قانون اور ضابطے کا تصور بھی پیدا ہوتا ہے۔ اب قانون اور ضابطے کے تصور کے مقتضیات و لوازم میں کسی مقنّن اور کسی مطاع کا تصور بھی شامل ہے۔ یعنی ایسی ہستی کا تصور جو قانون عطا کرنے والی (Law Giver) ہو۔ اب مزید آگے بڑھئے۔ جزا و سزا، قانون و ضابطہ اور مقنّن و مطاع کے تصورات و مقتضیات میں اطاعت کا تصور ایک ناگزیر لازمہ کی حیثیت سے شامل ہے۔ قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح "دین" ان تمام تصورات کے اجتماع سے بنی ہے اور از روئے قرآن اس کا مفہوم و مطلب یہ ہے کہ:

> "ایک پورا نظام زندگی اور مکمل ضابطۂ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع، مقنّن (Law Giver) اور حاکمِ مطلق (Sovereign) مان کر اس کی جزا کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ قانون اور

ضابطے کے مطابق اس ہستی (یا ادارے) کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے!"

دین کے اس تصور کو اس کی تمام تر کُلیت کے ساتھ سامنے رکھیے۔ قرآن مجید سے ہمیں لفظ دین کا یہی جامع تصور ملتا ہے۔ اس کے لئے اب میں قرآن مجید ہی سے استشہاد کرتا ہوں۔

دین الملک: سورۂ یوسف میں "دِیْنِ الْمَلِکِ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن ہی سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر میں بادشاہت کا نظام قائم تھا اور حضرت یوسفؑ اس نظام میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ قحط کے دور میں جب ان کے بھائی دوبارہ غلہ لینے مصر پہنچے اور آپؑ نے اپنے چھوٹے بھائی بن یامین کو اپنے پاس روکنا چاہا تو اُس وقت مصر میں نظامِ بادشاہت کا جو قانون رائج تھا اس کے تحت ان کے لئے اپنے بھائی کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک خصوصی تدبیر فرمائی۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہے:

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ

"اِس طرح ہم نے اپنی تدبیر سے یوسفؑ کی تائید کی (یعنی اس کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کا ایک سبب بنا دیا) اُس (یوسف) کا کام یہ نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا ——— اِلّا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے!"

چنانچہ دیکھ لیجئے کہ بادشاہت کے پورے نظام کو جو بادشاہ کی حاکیت کی بنیاد پر مصر میں رائج تھا "دین الملک" سے تعبیر کیا گیا۔

دین اللہ: اس وضاحت کو سامنے رکھ کر اب آخری پارے کی مختصر سی سورت "سورۃ النصر" کو اپنے سامنے لائیے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ

"جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہو گئی اور (اے نبیؐ) آپ نے دیکھ لیا
کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔"

اس مقام پر جو "دین اللہ" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس کو سمجھنا ضروری ہے کہ یہ دین اللہ کیا ہے؟ دین اللہ یہ ہے کہ صرف اللہ کو مطاع و حاکمِ مطلق اور مقنّنِ حقیقی تسلیم کر کے اسی کی جزا کی امید رکھتے ہوئے اور اسی کی سزا سے خوف کھاتے ہوئے' صرف اسی کے قانون' اسی کے ضابطے اور اسی کی عطا کردہ شریعت کے مطابق اپنے انفرادی و اجتماعی معاملات کو سرانجام دیا جائے۔ بالفاظ دیگر اپنی پوری زندگی میں صرف اور صرف اسی کی کامل اطاعت کو لازم کر لیا جائے۔ اسی رویّے اور طرزِ عمل کا نام ہے اللہ کے دین کے تحت زندگی گزارنا اور قرآن مجید میں اسی کا حکم بایں الفاظ دیا گیا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً "اے اہل ایمان (اللہ کی) اطاعت میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!"

ہر دین غلبہ چاہتا ہے: از روئے قرآن "دین" کا جو تصور ہمارے سامنے آتا ہے اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار سے اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دین درحقیقت دین ہے ہی نہیں جو غالب نہ ہو۔ چنانچہ انگریز کے دور میں جس دین کی اصل حکمرانی تھی وہ "دینِ انگریز" تھا۔ وائسرائے ہند کو تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت حاصل تھی اور مطاعِ مطلق برطانوی پارلیمان تھی۔ مسلمانوں کو نماز روزے کی اجازت تھی' لیکن دین اسلام غالب نہ تھا۔ اِس مفہوم کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا ہے۔

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

جدید ذہن "دین" کو "مذہب" کا مترادف سمجھتا ہے اور اسے ایک نجی (پرائیویٹ) معاملہ قرار دیتا ہے۔ بدقسمتی سے پوری دنیا میں اکثر و بیشتر' مذہب کا یہی تصور راسخ ہو گیا ہے۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔ اسلام مذہب نہیں' بلکہ دین ہے۔ خود قرآن حکیم میں فرمایا گیا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔ مذہب کے لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ چند مابعد الطبیعات عقائد (Dogmas) کو مان لیا جائے اور ان عقائد

کے تحت چند مراسمِ عبودیت (Rituals) کی انجام دہی اور چند معاشرتی رسوم (Social Customs) کی پابندی کر لی جائے تو مذہب کا تقاضا پورا ہوگیا۔ مذہب کا تعلق واقعتہً انسان کی شخصی، ذاتی اور نجی زندگی ہی سے ہے۔ اس معنی میں اسلام مذہب ہے ہی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام کی تعبیر کے لئے لفظ "مذہب" نہ کہیں قرآن مجید میں وارد ہوا ہے اور نہ ہی پورے کے پورے ذخیرۂ احادیث میں کہیں استعمال ہوا ہے۔ بلکہ ہر جگہ اصل اصطلاح "دین" ہی استعمال ہوئی ہے، جس کا وسیع تر مفہوم و مطلب میں بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ ہماری بول چال کے حوالے سے آپ اسے اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھنا چاہیں تو اس کے لئے ہماری زبان کی جدید اصطلاح "نظامِ حیات" ہے، جو ادائیگیٔ مفہوم کے اعتبار سے لفظ "دین" کے قریب ترین ہے۔

دینِ جمہور: "دین الملک" اور "دین اللہ" جیسی قرآنی اصطلاحات کے بعد اب "دین جمہور" کی اصطلاح پر غور کیجئے۔ موجودہ دور میں جب مذہب کو انسانی زندگی کا محض ایک نجی معاملہ بنا دیا گیا تو دین کے جامع تصور یعنی اس کے نظامِ حیات ہونے کے تصور کی جگہ خالی ہوگئی۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے آپ سے آپ دنیا میں اس تصور اور نظریے نے رواج پا کر قبولِ عام حاصل کر لیا کہ زندگی کے اجتماعی معاملات، اصول و ضوابط اور معاشرتی نظام "جمہور" خود اپنی رائے، اپنی مرضی، اپنی پسند و ناپسند اور اپنے تجربات و مشاہدات کے اعتبار سے طے کریں گے۔ جمہور یا ان کے نمائندے یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز، کیا صحیح ہے اور کیا غلط! ان کے لئے کسی آسمانی شریعت یا ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ پارلیمان کی اکیاون فیصد اکثریت کو ہر بات کے فیصلے کا اختیارِ مطلق حاصل ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ دو مردوں کی شادی کے جواز کا قانون پاس کر دے، جیسا کہ فی الواقع برطانوی پارلیمان نے کیا۔ وہ چاہے تو سڑکوں پر، پارکوں، کلبوں اور بازاروں میں، فلموں اور ڈراموں میں اور اسٹیج پر عریانی، مادر زاد برہنگی، حتیٰ کہ جنسی فعل تک کو جائز قرار دے دے، جیسا کہ بعض یورپی ممالک اور امریکی ریاستوں میں اس فحاشی پر کوئی قدغن نہیں ہے، بلکہ اس شیطانی عمل کو قانون کا تحفظ حاصل ہے۔ اسی طرح پارلیمان چاہے تو قمار بازی، سٹہ، لاٹری اور اسی قبیل کے منکرات

کو تفریح کا مقام دے کر انہیں قانونی طور پر جائز قرار دے دے' جیسا کہ فی الواقع دنیا کے اکثر ممالک نے کر رکھا ہے۔ شراب نوشی' جنسی بے راہ روی' زنا' عملِ قومِ لوط' عریانی' قمار بازی' غرضیکہ کوئی شیطانی عمل ایسا نہیں کہ جس کو سندِ جواز دینے کے لئے جمہور کے نمائندوں کی اکیاون فیصد اکثریت مجاز نہ ہو۔ قانون سازی اور حدود و تعزیرات کی تعیین کسی اخلاقی قدر اور آسمانی ہدایت کی پابند نہیں بلکہ اس کے لئے معیار جمہور کی پسند اور ناپسند ہے۔ انہیں اس میں ردّو بدل اور ترمیم و تنسیخ کا بھی پورا حق حاصل ہے۔ اس طرزِ فکر اور نظریے کے لئے ایک اصطلاح "سیکولرازم" یعنی لادینی نظامِ حیات وضع ہوئی اور آج اسی فکر کا ساری دنیا میں غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ ہم پاکستانی بھی' جنہوں نے نظامِ اسلامی کے قیام کے لئے تحریک پاکستان چلائی تھی اور پاکستان قائم کیا تھا' اپنی روح کے اعتبار سے اسی نظامِ حیات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ عملی طور پر چاہے ہم ابھی اس طرزِ فکر کی پوری نقالی نہ کر رہے ہوں لیکن فکری طور پر اسی نظریہ کا ہم پر کامل غلبہ و استیلاء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ہدایت اور شریعت سے آزاد یہ "جمہوریت" نہ صرف ایک لعنت ہے' بلکہ خدا سے بغاوت ہے' سرا سر معصیت ہے' طغیان اور سرکشی ہے اور فکر سے لے کر عمل تک بالکلیہ کفرو شرک ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ جو دین اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نازل کیا تھا اور جو خاتم النبیین و المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیل پذیر ہوا' اس کے نزول کا مقصد اس دین اللہ کا بالفعل قیام ہے۔ یعنی اللہ کا دین بالفعل قائم ہو اور تمام معاملات اس کے مطابق طے ہوں' تمام امور کا تصفیہ اسی کی روشنی میں کیا جائے۔ کسی شے کو حلال یا حرام اور جائز یا ناجائز قرار دینے کا مختار و مجاز صرف اور صرف اللہ کو تسلیم کیا جائے اور اس سے سرِ مو انحراف نہ کیا جائے۔

دین اور شریعت کا فرق

اِس موقع پر ایک اشکال آپ سے آپ ذہن میں آتا ہے کہ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور تھی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کی شریعت اور ہے۔ ان دونوں شریعتوں کا فرق تو ہمیں معلوم ہے' اس لئے کہ تورات منحرف صورت میں ہی سہی' موجود ہے اور قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ بھی بتمام و کمال محفوظ ہے۔ البتہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفے اور ان کی شریعتیں موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا شریعت محمدیؐ اور شریعت موسویؑ کے مابین فرق آج بھی تیقّن کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً نمازوں کی تعداد اور اوقات میں اور روزہ کے احکام میں فرق بہت واضح ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو چیز مشترک ہے وہ کوئی اور چیز ہے اور جس میں باہمی فرق ہے وہ مختلف چیز ہے۔ ان دونوں کے لئے دو مختلف اصطلاحات ہیں۔ چنانچہ ایک کا نام "دین" اور دوسری کا نام "شریعت" ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و رسل کا دین ایک ہی رہا ہے۔ اس میں کسی دور میں بھی قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ دین یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کے مقتضیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا جائے' اس کے بھیجے ہوئے انبیاء و رسل اور اس کی اتاری ہوئی کتابوں کی تصدیق کی جائے' ملائکہ' بعث بعد الموت' حشر و نشر' حساب و کتاب' جزا و سزا اور جنت و دوزخ پر پختہ یقین رکھا جائے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاکمِ مطلق اور مقنّنِ حقیقی تسلیم کیا جائے۔ جبکہ شریعت عملی زندگی کے احکام پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ حالات کے بدلنے' انسانی ذہن کے ارتقاء اور تہذیب و تمدن اور وسائل و ذرائع کی ترقی کے ساتھ ساتھ احکامِ شریعت میں تغیر و تبدل ہوتا رہا' تا آنکہ شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ لیکن جہاں تک دین کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے اور وہ "اسلام" ہے' ازروئے الفاظ قرآنی: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ـــ ـــ کہ دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے!

دین اور شریعت کے فرق کو آپ دورِ جدید کی دو اصطلاحوں کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں۔ کسی بھی ملک کا ایک تو "اساسی دستور" ہوتا ہے' جس میں یہ متعین ہوتا ہے کہ حاکم کون ہے' حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے اور وہ حاکمیت کس طرح استعمال (Channelize) ہوگی۔ حاکمیت کے تحت قانون بنانے کا طریقہ (Process) کیا ہوگا' وہ حاکمیت کیسے روبہ عمل (Exercise) ہوگی' قوانین میں ردو بدل کیسے ہوگا'

ملکی انتظام کیسے چلے گا' عدلیہ اور انتظامیہ کے مختلف شعبوں کا باہمی ربط کیا ہوگا' اور ایک دوسرے کے لئے احتساب و محاسبہ اور ان میں باہمی توازن (Checks And Balances) کا نظام کیا ہوگا؟ اساسی دستور ان تمام مسائل پر محیط ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کا دستور بناتے ہوئے اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کی اساسی دفعات بہت پائیدار اور مستحکم ہوں۔ چونکہ ان میں بار بار کی تبدیلی مناسب نہیں ہوتی اس لئے اس میں تبدیلی کے طریقِ کار کو بڑا ہی مشکل رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس اساسی دستور کے تحت جو قوانین بنتے رہتے ہیں ان کا معاملہ دوسرا ہے۔ تعزیرات علیحدہ لکھی جاتی اور طے کی جاتی ہیں' دیوانی اور فوجداری قوانین علیحدہ مدوّن کیے جاتے ہیں اور ان میں ملکی دستور کے تحت حسبِ ضرورت آسانی سے ردو بدل کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو آرڈیننسز (Ordinances) کے ذریعے سے بھی قوانین میں رد و بدل ہوجاتا ہے' لیکن جمہوری ممالک میں تو بہر حال یہ اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہوتا ہے کہ وہ ۴۹ اور ۵۱ کے فرق سے قانون بنا بھی سکتی ہے اور اس میں ردوبدل بھی کر سکتی ہے۔ تو اس کو یوں سمجھئے کہ ہمارے دین کے نظام میں دستور کی جگہ تو "دین" کی اصطلاح ہے اور قانون کی جگہ "شریعت" کی اصطلاح ہے۔ دین اصل میں اس سے بحث کرتا ہے کہ مطاع کون ہے' حاکم کون ہے' حاکمیت کس کی ہے' قانون کس کا چلے گا' مرضی کس کی چلے گی اور وہ حاکمیت کس طرح روبہ عمل آئے گی؟ یعنی یہ کس کے واسطے سے ہوگی' حاکم مطلق کے نمائندے کی حیثیت کیسے حاصل ہوگی؟ یہ تمام امور ہمیشہ سے طے شدہ ہیں اور ان میں کبھی کوئی فرق نہیں رہا کہ مطاعِ مطلق اور حاکمِ مطلق صرف اللہ ہے جو "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" کی شان کا حامل ہے۔ اس کی طرف سے ملنے والا ہر قانون واجب العمل ہے اور اسے لے کر آنے والے نمائندے اس کے رسول ہیں۔ اس کے قانون کی جو تعبیر (Interpretation) اس کا نمائندہ (یعنی رسولؐ) کرے اسے قبول کرنا اور اس کی روشنی میں اپنے معاملات طے کرنا لازمی ہے۔ جن معاملات میں قرآن و حدیث کی کوئی نصِ قطعی موجود نہ ہو انہیں دین کی روح کے تحت باہمی مشاورت سے طے کیا جاسکتا ہے' لیکن جو حدود و قیود اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے عائد کردی گئی ہیں ان سے سرِمو

ہٹنے یا اس میں رد و بدل کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ہے آیت کے اس حصے کی شرح کہ:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى....

اقامتِ دین کا حکم

آیت کے اگلے ٹکڑے میں اب وہ اصطلاح وارد ہو رہی ہے جو ہماری آج کی گفتگو کا عنوان ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ تمہیں کس لئے دیا گیا ہے؟ کیا اس لئے کہ تم اللہ کی عطا کردہ کتابِ دستور کو محض حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بنا لو؟ اس کا احترام بس اس طرح سے کر لو کہ اسے ریشمی جزدان میں لپیٹ کر رکھ لو اور ہاتھ سے گر جائے تو اس کے برابر اناج تول کر دے دو؟ کہیں کوئی تقریب ہو' چاہے وہ کسی سینما' کلب' بار' ناچ گھر یا ریس کورس کی افتتاحی تقریب ہو' تو اس کی تلاوت کر لو؟ معاذ اللہ' ایسا ہرگز نہیں! بلکہ یہ دین تو محض اس لئے دیا گیا ہے کہ:

اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ

"کہ اس دین کو قائم کرو اور اس باب میں تفرقہ کا شکار نہ ہو جاؤ!"

یہ دین اپنا نفاذ اور غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دستور اور قانون بے معنی ہے جو کہیں نافذ نہیں۔ ہمارے ملک کے ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء کے جو دستور رکھے ہوئے ہیں کیا وہ واقعی دستور کہلائے جا سکتے ہیں' جبکہ وہ نافذ ہی نہیں۔ یہ تو بس ہماری تاریخ کی یادگار بن کر رہ گئے ہیں۔ کوئی دستور صحیح معنوں میں اسی وقت دستور کہلا سکتا ہے جبکہ وہ نافذ بھی ہو۔ قانون اسی کو کہا جائے گا جس کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہو رہے ہوں۔

طرفہ تماشا

یہ عجب طرفہ تماشا ہے کہ دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کے نام سے جو قوم بس رہی ہے وہ دعویٰ تو اس بات کا کرتی ہے کہ اصل دستور اور قانون خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے' لیکن یہ عجیب شتر گربگی ہے کہ ان کا عمل اس دعویٰ

کے بالکل برعکس ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا عطا کردہ دستور و قانون ان کی عملی و اجتماعی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کے ہاں قرآن و سنت کے اوامر و نواہی کی سرے سے کوئی وقعت ہی نہیں، لہٰذا کوئی فیصلہ اس کے مطابق نہیں ہو پاتا۔ قرآن کا استعمال بس حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کے لئے رہ گیا ہے، جبکہ وہ قرآن حکیم کے ضابطۂ حیات اور پوری زندگی کے لئے کامل ہدایت و رہنمائی ہونے کے دعویدار بھی ہیں۔ مسلمان قوم کے اس طرزِ عمل کو ایک اعجوبہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ سورۃ الرعد میں منکرینِ قیامت کا ایک اعتراض نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (آیت ۵)

یعنی اگر تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل تو ان کی یہ بات ہے کہ آیا جب ہم مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا!

لہٰذا اگر دنیا کو کسی بات پر تعجب کرنا چاہیے تو وہ ہمارا یہ طرزِ عمل ہے کہ ایک طرف تو ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارا دستور، ہمارا قانون اور ہمارا ضابطۂ حیات اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل ہے، چنانچہ دنیا کے تمام قوانین و دساتیر سے افضل ترین ہے۔ پھر ہم یہ بھی برملا کہتے ہیں کہ اسی پر عمل پیرا ہونے سے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح اور خیر و صلاح حاصل ہو سکتی ہے، لیکن دوسری طرف اس کامل ترین اور افضل ترین دستورِ حیات سے ہماری بے اعتنائی اور رُوگردانی بھی دنیا سے مخفی نہیں ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران یہ بھی کہا گیا تھا کہ "لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان کا دستور کیا ہوگا؟ میں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا دستور تو چودہ سو سال پہلے سے طے شدہ ہے!" ـــــ لیکن عملاً جو کچھ اب تک ہوا اور جو ہو رہا ہے وہ دنیا کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ قابلِ تعجب بات کیا ہوگی کہ جو ملک اس اصول پر قائم ہوا تھا کہ اس کا دستور اور ضابطۂ حیات کتاب و سنت ہوگا اس ملک میں پوری چوتھائی صدی بیت جانے کے بعد بھی اس دستور کی تنفیذ و نفاذ کا مرحلہ روزِ اوّل سے بھی بعید نظر آرہا ہے۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو یہ معاملہ اتنا بعید نہیں تھا جتنا آج ہے، حالانکہ یہاں بستے سب مسلمان

ہیں۔ سب کے سب قرآن حکیم پر ایمان کے مدّعی بھی ہیں اور اسے اپنا دستور، قانون اور ضابطۂ حیات بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اسی قرآن میں ہمارے لئے یہ حکم موجود ہے کہ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ۔

"اقامت" کا مفہوم

"اَقِیْمُوا الدِّیْنَ" کا ترجمہ "قائم کرنا" بھی کیا گیا ہے اور "قائم رکھنا" بھی۔ نتیجے کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دین پہلے سے قائم اور غالب ہے تو اس کو اس حالت پر برقرار رکھنا اقامتِ دین ہے۔ لیکن اگر دین بالفعل قائم نہیں ہے تو اسے دنیا میں قائم اور غالب کرنے کی جدّوجہد کرنا اقامتِ دین کا تقاضا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک "اقامت" کا معنیٰ "سیدھا رکھنا" ہے، یعنی حکم دیا جارہا ہے کہ اس دین میں کجی نہ کرو، اس کی کسی چیز کو بدلو نہیں! تمہیں اس میں کسی کمی بیشی اور ترمیم کا اختیار حاصل نہیں، یہ دین تمہیں بطور امانت دیا گیا ہے اور اس کو جوں کا توں رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے! ٹھیک ہے! "اقامت دین" کا ایک مفہوم یہ بھی ہے، لیکن سیدھی سی بات ہے کہ اسے جوں کا توں رکھنا کس مقصد کے لئے ہوگا؟ اسے صرف کتابوں میں محفوظ کرلینا یا صرف آثار قدیمہ کے طور پر محفوظ رکھنا تو مقصود نہیں ہے۔ اس کو محض اپنے نسلی عقیدے کے طور پر مقدس یادگار بنا کر تو نہیں رکھنا ہے۔ بلکہ اگر یہ دین زندگی کے معاملات سے متعلق ہے تو اس کی حفاظت بھی اس کو قائم کرنے کے لئے مقصود ہے، تاکہ تمام معاملات اللہ کی مرضی کے مطابق طے پائیں۔ چنانچہ "اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ" کا منشا و مفہوم یہ ہوگا کہ دین کو قائم کرو، اس کی ٹھیک ٹھیک حفاظت کرو، اور اپنے سارے معاملات اس کے مطابق طے کرو اور اس امر میں تمہارے مابین تفرقہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں اختلاف کی نہ کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی اجازت!

فقہی اختلافات 'تفرقہ' نہیں

فقہی جزئیات اور فروعات میں حنفی اور شافعی یا دوسرے ائمہ فقہاء کی آراء میں

کہیں فرق ہے تو یہ دین کا فرق نہیں، بلکہ صرف شریعت اور قانون کی تعبیر میں آراء کا فرق ہے۔ دین تو ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا۔ اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے مابین اختلاف امر محال ہے۔ یہ اختلاف تو جملہ انبیاء و رسل کے مابین بھی نہیں بلکہ سب کا دین ایک ہی ہے اور یہ بات سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مطاعِ مطلق اور مالکِ حقیقی ہے۔ وہی اس کائنات کا خالق ہے اور حاکمیت کا حق بھی اسی کا ہے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ـــــــ ہمارا کام اللہ کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہے۔ اللہ کا عطا کردہ دستور و قانون ہم تک اس کے نبیؐ کی وساطت سے پہنچا ہے۔ چنانچہ ہمارا کلمہ دو اجزاء پر مشتمل ہے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ـــ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" رسولؐ کی حیثیت اللہ کے نمائندے اور اس کے بندوں کے درمیان رابطے کی ہے۔ چنانچہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ـــ پس اس معاملہ میں سرے سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، اس میں تفرقہ ڈالنے، اس کے بارے میں اختلاف کا شکار ہونے اور اس میں اپنی رائے سے جداگانہ راہیں نکالنے سے یہ کہہ کر منع فرما دیا گیا کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ

دینِ حق کا قیام مشرکین پر بھاری ہے

اس کے بعد یہ بات فرمائی گئی:

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ

"(اے نبیؐ) مشرکوں پر یہ بات بہت بھاری ہے جس کی آپ انہیں دعوت دے رہے ہیں!"

مکی سورتوں کے عام اسلوب کے مطابق یہاں پر خطاب اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن درحقیقت ہر دور کے مسلمان اس کے مخاطب ہیں، جو اس دعوت کے داعی

بن کر کھڑے ہو جائیں ۔ چنانچہ آنحضورؐ کے نقشِ قدم پر چلنے والے داعیانِ دین اور علمبردارانِ حق سب ہی اس کے مخاطب ہیں۔ یہاں یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ کلمۂ توحید' جو تمہاری دعوت کی بنیاد ہے' بظاہر بڑا ہی بے ضرر سا کلمہ ہے' لیکن اس کے جو لوازم ہیں' اس کے جو متضمنات و مقتضیات ہیں ان کو وہ لوگ خوب سمجھتے ہیں جو شرک پر کار بند ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی ضرب ان کے مفادات پر کہاں کہاں پڑے گی۔ ایک سادہ لوح مسلمان کے علم میں شاید یہ بات نہ ہو کہ توحید کی زد کہاں کہاں پڑ رہی ہے لیکن مشرکین اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے یہ دعوت بہت بھاری ہے اور وہ ٹھنڈے پیٹوں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ اللہ کا دین قائم اور غالب ہو۔

نظامِ شرک

اِس موضوع پر مفصّل گفتگو تو قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب میں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع اور سورۃ الحج کے آخری رکوع کے درسوں کے ضمن میں ہوتی ہے ۔ یہاں مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ شرک کی دنیا میں ہمیشہ دو نظام رہے ہیں' ایک سیاسی استحصال' اور دوسرا معاشی استحصال ——— اور ان دونوں استحصالی نظاموں نے ہمیشہ مذہب اور دھرم کا لبادہ اوڑھے رکھا ہے۔

سیاسی شرک: اس کی ایک صورت تو یہ رہی ہے کہ کوئی انسان خود خدائی کا دعویدار بن بیٹھے کہ مرضی میری چلے گی' میں نہیں جانتا کہ خدا کا کیا حکم ہے اور رسول کیا کہتا ہے' اقتدار کا مالک میں ہوں لہٰذا حکم صرف میرا چلے گا! اس سیاسی شرک کا نام ملوکیت اور آمریت ہے جس پر کسی قدر گفتگو "دین الملک" کی بحث میں ہو چکی ۔ اس کی بد ترین مثال فرعون اور نمرود نے قائم کی۔ سیاسی شرک کی دوسری صورت' جو موجودہ دور میں بہت عام ہے' یہ ہے کہ کسی ملک کے عوام اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا انکار کردیں اور یہ کہیں کہ خدا اور رسول کو ماننا ایک نجی معاملہ ہے۔ جو انہیں مانتے ہیں وہ مسجدوں' مندروں اور کلیساؤں میں ان کا حکم چلا لیں' باقی رہا ملک کا قانون تو وہ عوام کی اکثریت کی مرضی کے مطابق بننا چاہیے۔ اس کا نام ہے جمہوریت' جس پر میں "دینِ جمہور" کے

ضمن میں کچھ روشنی ڈال چکا ہوں۔ یہ جمہوریت بھی اسی طرح کا بد ترین شرک ہے جس طرح ملوکیت اور آمریت ہے۔ سیاسی شرک کی تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ایک قوم حکومت کی مدّعی بن کر دوسری قوم کو محکوم بنا لے کہ ہم تمہارے آقا ہیں' لہٰذا مرضی ہماری چلے گی۔ جیسے انگریز قوم نے ہمیں اپنا محکوم بنا کر ہمارے ساتھ یہ طرزِ عمل روا رکھا تھا۔ انہوں نے بس اس قدر مذہبی آزادی دے رکھی تھی کہ ہم نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج اپنے دین کے مطابق کر لیں' لیکن ملکی قانون (Law of the Land) ان کا تھا۔ مرضی اور پسند تاجِ برطانیہ کی چلتی تھی اور وائسرائے ہند اس کا نمائندہ تھا۔ گویا تاجِ برطانیہ "الٰہ" تھا اور وائسرائے اس کا "رسول" تھا۔ یہ سیاسی شرک کی تیسری صورت ہے۔ چنانچہ سیاسی طور پر کوئی آمر' کوئی بادشاہ' یا کوئی قوم حاکیت کے مقام پر فائز ہو جائے اور ملک کے تمام معاشی ذرائع و وسائل اور تمام قومی دولت کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق استعمال کرے تو یہ سیاسی شرک ہے۔

<u>مذہبی شرک</u>: یہ سیاسی شرک ہی کی ایک عظیم فرع ہے' جس کو اچھی طرح جان لینا ضروری ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ چند بڑے ہوشیار اور چالاک لوگ دیوی اور دیوتاؤں کے نام پر استھان اور مندر بنا کر یا اولیاء و صلحاء کے نام پر مقبرے' تکیے اور درگاہیں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ ان کے نام پر جو نذرانے آئیں' نذریں اور نیازیں چڑھائی جائیں ان سے ان کے حلوے مانڈے چلتے رہیں اور خواہشاتِ نفس پوری ہوتی رہیں۔ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہمیں خوش کرو گے تو یہ دیوی دیوتا تم سے راضی ہو جائیں گے اور یہ بزرگ تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اس طرح تمہاری دنیوی مرادیں بھی بر آئیں گی اور خدا بھی تم سے خوش ہو جائے گا۔

یہ در حقیقت انسانوں کا خون چوسنے کے سیاسی اور مذہبی طریقے ہیں جو ہمیشہ سے دنیا میں جاری رہے ہیں۔ ایک طرف بادشاہ لوگوں کی گردنوں پر مسلّط ہو کر ان سے خراج وصول کرتے رہے ہیں اور دوسری طرف اس طرح کے چالاک اور ہوشیار لوگ مذہب کے نام پر لوگوں کو بیوقوف بنا کر ان سے نذرانے وصول کرتے آرہے ہیں۔ یہ لوگ کیسے برداشت کر لیں گے کہ اللہ کی توحید کا شہرہ ہو اور توحید باری تعالیٰ پر مبنی نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہو جائے۔ اسی لئے فرمایا گیا: کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْھُمْ اِلَیْہِ کہ

مشرکوں پر وہ چیز بہت بھاری ہے جس کی دعوت (اے نبیؐ) آپ انہیں دیتے ہیں!

سیاسی اور مذہبی مشرکین میں تعاون: مشرکین صرف خود ہی شرک نہیں کرتے بلکہ نظامِ شرک کے استحکام کے لئے ایک دوسرے سے بھرپور تعاون (Joint Hand) بھی کرتے ہیں۔ مشرک آپس میں ایک دوسرے کے ساتھی بن جاتے ہیں اور ایک شرک دوسرے شرک کو انگیز بھی کرتا ہے، لیکن اہلِ شرک توحید کو کبھی برداشت نہیں کرتے۔ ان کا باہمی گٹھ جوڑ ہوتا ہے کہ کوئی سورج دیوتا کا مندر بنالے، کوئی چاند دیوتا کا اور کوئی خود خدائی کا یا خدا کے اوتار ہونے کا دعویٰ کرے اور "**نِصفٌ لی و نصفٌ لکَ هذا قومٌ جاهلون**" کے مصداق دونوں طرف سے لوگوں کو بے وقوف بنا کر لُوٹا جائے۔ چنانچہ بے چارے عوام الناس ایک طرف تو بادشاہ کو ٹیکس اور خراج ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف پنڈت، پروہت، پوپ، پجاری اور پیر صاحب ان سے اپنے نذرانے وصول کرتے ہیں۔ دونوں طرف سے تعاون اور خیر سگالی کے طور پر ایک دوسرے کی مدح بھی کی جاتی ہے۔ بادشاہ کی طرف سے ان مذہبی پیشواؤں کو خطابات سے نوازا جاتا ہے اور ان کی طرف سے بادشاہ کو خطابات و القاب دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ پوپ کی طرف سے "بادشاہ کے مقدس حقِ حکمرانی" (Divine Right of the King) کو تسلیم کیا جاتا ہے اور وہ پوپ کے تقدس کے اظہار کے لئے اسے "His Holiness" جیسے بڑے بڑے القاب سے نوازتا ہے۔ پروہت اور پنڈت، حکمرانوں کا سلسلۂ نسب دیوی دیوتاؤں سے قائم رکھتے ہیں اور بادشاہ سلامت اپنی اطاعت کے ساتھ ان پنڈتوں، پجاریوں اور پروہتوں کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں راسخ کرتے ہیں۔ غرضیکہ شرک کے یہ دونوں نظام باہمی گٹھ جوڑ سے ایک دوسرے کو قوت فراہم کرتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کوئی بھی توحید کو کسی صورت برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ اس سے ان کی زرگری کی جڑ کٹتی ہے، مفادات ختم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت مشرکین پر بہت بھاری اور گراں گزرتی ہے

مصلح اور رسول کی دعوت کا فرق

یہاں یہ بات بھی وضاحت سے سمجھ لیجئے کہ ایک رسول اور مصلح کی دعوت میں بڑا بنیادی

فرق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف واعظ اور معلّمِ اخلاق بن کر کھڑا ہو تو اس کی بات لوگوں پر اتنی گراں نہیں گزرتی جتنی اُس شخص کی بات جو اس بات کا داعی بن کر اٹھے کہ میں اس پورے نظامِ باطل کو، جو غیر اللہ کی اطاعت پر قائم ہے اور جس کی اساس شرک پر ہے، بالکل نیست و نابود کروں گا اور اللہ کی اطاعت پر مبنی نظام قائم کروں گا۔ یہ دعوت ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کی جاتی۔ اس لئے کہ غیر اللہ کی اطاعت اور مشرکانہ بنیادوں پر قائم نظامِ باطل سے کچھ لوگوں کے سیاسی و معاشی مفادات اور مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ پیچ در پیچ ایسے بندھنوں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر یہ نظام تلپٹ ہوا تو یہ سب کچھ بدل جائے گا، بہت سے اوپر والے نیچے اور نیچے والے اوپر ہوجائیں گے۔ اس طرح ہمارے مفادات پر ضرب پڑے گی اور ہماری سیاست و چودھراہٹ ختم ہوجائے گی، ہمارا وقار اور احترام خاک میں مل جائے گا، ہمارا اعتماد جاتا رہے گا۔ اس لئے توحید پر مبنی اسلام کے عادلانہ نظامِ اجتماعی کے قیام کی دعوت مشرکانہ نظام کے مقتدروں، سرداروں اور مہنتوں کو کبھی برداشت نہیں ہوسکتی۔ البتہ اگر آپ کسی جزوی اصلاح کی دعوت لے کر اٹھیں، ریفارمر کی حیثیت اختیار کریں یا دین کی محض وہ باتیں پیش کریں جن سے کسی کے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو تو پھر آپ کی کسی طرف سے کوئی مخالفت نہیں ہوگی۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو پھولوں کے ہار پہنائے جائیں، آپ کا شاندار استقبال کیا جائے اور آپ کی خدمت میں سپاسنامے پیش کئے جائیں۔

اہلِ ایمان کو تسلی

آگے فرمایا:

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ○

"اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اپنی طرف (یعنی اپنے دین پر) آنے کا راستہ اس پر کھول دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔"

آیتِ کریمہ کے اس ٹکڑے کے پس منظر میں اس پوری کشمکش اور پورے تصادم کی جھلک نظر آتی ہے جو اقامتِ دین کی جدّوجہد کے سلسلے میں اللہ کے نبیؐ اور مشرکین کے درمیان چل رہا ہے۔ مشرکین کو کسی درجہ میں یہ گوارا نہیں کہ یہ مشرکانہ نظام ختم

ہو جائے اور پوری کی پوری زندگی ایک اللہ کی اطاعت کے نظام کے تحت آجائے۔ چنانچہ وہ مزاحمت اور مخالفت پر کمربستہ ہیں اور ان کی دن رات یہ کوشش ہے کہ دینِ حق کا یہ چراغ گل کردیا جائے۔ ان انتہائی مایوس کن حالات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اس شدید مزاحمت و مخالفت اور تشدد سے دل برداشتہ نہ ہوں' اللہ تعالیٰ یقیناً راستہ کھولے گا اور بہت سے لوگوں کو' جنہیں وہ چاہے گا' اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں میں ذرا بھی اِنابت ہے' جو حق کے طالب اور جویا ہیں' ان کو بھی راہِ ہدایت سے بہرہ مند فرمائے گا۔ اس اجتباء اور ہدایت الی اللہ کی جھلک مسلمان ان آیات کے نزول سے پہلے دیکھ چکے تھے اور اس کے بعد بھی اس کے مناظر ان کے سامنے آتے رہے۔

"اجتباء" کی مثالیں

اجتباء کا صحیح مفہوم ہے کسی کو کسی مقصد کے لئے پسند کرلینا' چن لینا اور کھینچ لینا۔ یہاں جو فرمایا گیا تا اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ (اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے!) اس مفہوم کو یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے: "اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے دین کی خدمت کے لئے پسند کرلیتا ہے' چن لیتا ہے!" اس اجتباء کی دو درخشاں مثالیں ملاحظہ ہوں:

پہلی مثال حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کا قبولِ اسلام ہے۔ آنجنابؓ توحید و شرک کی کشمکش سے بے نیاز روز و شب اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے' جن میں سب سے زیادہ نمایاں شوق تیر اندازی اور شکار کا تھا۔ علی الصبح تیر کمان لے کر شکار کو نکل جانا اور شام کو واپس آنا ان کا معمول تھا۔ ایک روز ابو جہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادتی کی اور یہ زیادتیاں اُس وقت اس کے معمول میں شامل ہو چکی تھیں۔ شام کو واپس لوٹے تو ان کی ایک لونڈی نے انہیں اس زیادتی کا ماجرا سنایا۔ قرابت داری کے جذبے نے جوش کھایا اور اسی وقت جا کر اپنی کمان ابو جہل کے سر پر دے ماری۔ یہی جذبہ ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا ذریعہ بن گیا اور حمزہ ابن عبدالمطلب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثاروں میں شامل ہو گئے۔ آپؓ بارگاہِ نبویؐ سے "اَسَدُ اللّٰہ و

اَسَدُہٗ وَ رَسُولِہٖ" اور "سید الشہداء" کے القابات سے سرفراز ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

دوسری درخشاں مثال حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو اشخاص کے متعلق یہ دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ! عمر ابن الخطاب یا عَمرو ابن ہشام (ابوجہل) میں سے کسی ایک کو شرفِ قبولیت عطا فرما! اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کو چن لیا اور وہ عمرِ فاروقؓ بن گئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔۔۔ اسلام قبول کرنے سے قبل ان کی طبیعت میں غور و فکر کا کوئی مادہ، تلاشِ حق کا کوئی داعیہ یا کوئی ایسی علامت دکھائی نہ دیتی تھی جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہو کہ وہ خود سیدھی اور سچی راہ کے جویا تھے۔ بلکہ طبیعت میں لا اُبالی پن اور بے پرواہی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ حق دیتے ہوئے چھ برس گزر چکے تھے مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی، بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر تعصب سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت اور آپؐ کی دعوت سے بیزاری بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ننگی تلوار لے کر آنحضرتؐ کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور ایسے حالات پیدا فرمادیئے کہ پتھر دل موم ہوگیا۔ وہ عمرؓ جو نبی اکرمؐ کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے غلامانِ محمدؐ میں شامل ہوگئے اور ان کی یہ شان قرار پائی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لو کان بعدی نبیٌّ لکان عمرَ بنَ الخطّاب** "کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن الخطاب ہوتے!" (رواہ الترمذی، عن عقبۃ بن عامرؓ) ۔۔۔ تو یہ ہے اجتباء۔

بیعتِ عقبۂ اولیٰ کے موقع پر یثرب (مدینہ) سے مکہ آنے والوں میں سے کچھ سعید روحوں کو اللہ تعالیٰ نے دولتِ اسلام سے مشرف کردیا، وہ بھی ایک نوعیت کا اجتباء ہے۔ یہ لوگ جاہلیت کے رسم و رواج کے تحت حج اور عمرہ کے لئے مکہ آئے تھے اور کوئی طلبِ ہدایت اور تلاشِ حق ان کے پیشِ نظر نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے قبولِ ایمان کے لئے کھول دیئے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہوکر مؤمنینِ صادقین کے زمرے میں شامل ہوگئے۔ ان حضرات گرامی کی یہ بیعت ہی یثرب کے مدینۃ النبیؐ بننے اور دار الہجرت قرار پانے کی تمہید بن گئی ۔۔۔ رضی اللہ عنہم!

ہدایت کا حقدار کون؟

دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا ایک قاعدہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ جو بھی حق کا متلاشی ہوگا' جس کے دل میں بھی انابت ہوگی اس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کا راستہ ضرور دکھادے گا اس میں "پسند" کا معاملہ نہیں رکھا' بلکہ فرمایا: یَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ" کہ جس میں حق کی سچی طلب ہو' جو بھی انابت کی روش اختیار کرے' اس پر ہدایت کی راہ کھول دی جاتی ہے۔ اسی قاعدے کو سورۃ العنکبوت کے آخر میں یوں بیان فرمایا:

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا کہ وہ لوگ جو ہماری راہ میں مشقتیں اٹھاتے ہیں' جن میں حق کی طلب اور جستجو ہوتی ہے تو ہم لازماً ان کے لئے اپنے راستے کھولتے چلے جائیں گے! پس معلوم ہوا کہ جن میں انابت ہوتی ہے' جو کسی تعصب اور عصبیت میں مبتلا نہیں ہوتے' جن کے دلوں میں حق کی سچی طلب ہوتی ہے' جن کی فطرت سلیم ہوتی ہے' جو چاہتے ہیں کہ ان پر حق منکشف ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو سیدھا راستہ دکھادیتا ہے۔

شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں' بد سے بد تر نظام اور خراب سے خراب تر ماحول میں بھی ایسی سعید روحیں موجود ہوتی ہیں جن کی قلبی کیفیت کو سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا

"اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک پکارنے والے کی دعوت کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ' پس ہم ایمان لے آئے"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی سب سے درخشاں مثال ہیں۔ وہ اپنی فطرتِ سلیمہ اور طلبِ حق کی بنیاد پر صدّیقِ اکبر کے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ حضرت علی' حضرت عثمان' حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح' حضرت سعید ابن زید' حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف' حضرت طلحہ' حضرت زبیر ابن العوام اور حضرت سعد ابن ابی وقاص (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) جو عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں' اسی انابت الی اللہ کے طفیل سے دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے ہیں۔ تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ ہر دور میں ایسی سعید

روحیں موجود ہوتی ہیں جو حق کی متلاشی ہوتی ہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے واقعے پر غور کیجئے۔ طلبِ حق میں کہاں سے روانہ ہوئے، کن کن منزلوں پر ٹھہرے اور پھر کس طرح منزلِ مقصود تک پہنچے۔ اسی طرح طالبانِ حق کہاں کہاں سے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور شرفِ صحابیت سے مشرف ہوئے ـــــ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین!!

تفرقہ کا اصل سبب

جیسا کہ پہلی آیت میں بیان ہوا، تمام سابقہ امتوں کو یہ حکم ہوتا رہا ہے کہ "اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ" ـــــ کہ دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں تفرقہ میں مت پڑو! اب اگلی آیت میں اس کا سبب بیان کیا جارہا ہے کہ جب دین ایک ہے تو پھر تفرقہ کیوں ہوا؟ یہودیت نے ایک علیحدہ راہ کیوں نکالی اور عیسائیت نے علیحدہ کیوں؟ ہر سلیم العقل انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ تو توحید سے بھی واقف تھے اور وحی، بعثتِ انبیاء و رسل، انزالِ کتبِ ساوی، بعث بعد الموت اور محاسبۂ اخروی کے عقائد سے بھی واقف تھے۔ یہ امور ان کے لئے اجنبی نہ تھے۔ ان کے برعکس اہلِ عرب اُمّی شمار ہوتے تھے اور وہ ان عقائد سے آگاہ نہ تھے۔ تو پھر اہلِ کتاب نے آگے بڑھ کر اس دعوت کو قبول کیوں نہیں کیا، بلکہ اس کی مزاحمت و مخالفت میں مشرکین سے بھی زیادہ شدید کیوں ہوگئے؟ اس کا سبب معلوم ہونا ضروری ہے۔ عام طور پر تفرقے کے دو اہم سبب ہوسکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب حق آئے تو وہ واضح نہ ہو اور دوسرا یہ کہ باہمی ضدم ضدا اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے حق کا انکار کیا جائے اور تفرقے کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اگلی آیت میں قرآن مجید پہلے سبب کی نفی اور دوسرے سبب کا اثبات کررہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَمَا تَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ

"اور لوگوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا تھا، صرف اس لئے کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔"

پس معلوم ہوا کہ ان کے تفرقے کا اصل سبب ناواقفیت نہیں بلکہ ان کی ضد اور سرکشی تھا۔ ان کے پاس "العلم" آچکا تھا، یعنی ہدایتِ ربانی ان کو پہنچ چکی تھی، حق ان پر واضح ہوچکا تھا۔ اور حق تو جب بھی آتا ہے بہت واضح اور مبرہن ہو کر آتا ہے، بیّنہ بن کر آتا ہے۔ سورۃ البیّنہ میں اس مضمون کو مزید واضح کیا گیا:

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

"اور نہیں تفرقہ کیا ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس 'البیّنہ' آچکی تھی۔"

یعنی حق روشن اور مبرہن صورت میں ان کے سامنے پیش کیا جاچکا تھا۔ لہٰذا تفرقے کا اصل سبب لاعلمی اور ناواقفیت نہیں، بلکہ کچھ اور ہی ہے۔ چنانچہ اس تفرقے کے حقیقی سبب کو "بَغْيًا بَيْنَهُمْ" کے الفاظ سے واضح کیا گیا کہ اس کا اصل محرک آپس کی ضد، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی خواہش ہے۔ یا پھر قومی مفادات، قومی تفاخر، گروہی مناصب، ذاتی وجاہت و حشمت، اور دنیوی اغراض و مصالح کی خاطر حق سے اعراض کی روش اختیار کی جاتی ہے۔

اہلِ کتاب کے علاوہ سردارانِ قریش بھی اسی ضد کے سبب سے آنحضورؐ کی دعوت پر ایمان نہ لائے اور دینِ حق کی راہ میں مزاحم رہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال ابوجہل کا وہ قول ہے جو اس نے اس وقت کہا جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تمہارے خیال میں محمدؐ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں؟ اس نے جواب میں کہا تھا: نہیں، انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔۔۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنی ہاشم کے مابین ایک خاندانی مسابقت چل رہی تھی۔ بنو ہاشم نے مہمان نوازیاں کیں، ہم نے ان سے بڑھ کر کیں۔ انہوں نے حجاج کو کھانے کھلائے، ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے۔ انہوں نے ضیافت کے لئے اونٹ ذبح کئے، ہم نے ان سے زیادہ تعداد میں کئے۔ اس مسابقت میں اب تک ہم نے ان سے مات نہیں کھائی تھی، لیکن اب اگر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت مان لیں اور ان کی رسالت کو تسلیم کرلیں تو ہم پر بنی ہاشم کی برتری ابدالآباد تک قائم ہوجائے گی!۔۔۔ چنانچہ اس کی اس بات سے مخالفت اور تفرقہ کا اصل سبب واضح ہوتا ہے۔

یہی معاملہ یہود کا ہوا۔ قرآن مجید کی شہادت یہ ہے کہ: اَلَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ

الزّمان کا ظہور ہوگا' اگر حقیقی ہدایت اور حق کی طلب ہے تو وہاں پہنچو اور ان کی بعثت کا انتظار کرو! یثرب اور اس کے قرب و جوار میں رہنے والے یہودی اوس و خزرج کے قبیلوں کو دھمکایا کرتے تھے کہ ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے' اور ہم جب اس کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں گے تو تم ہمارا مقابلہ نہیں کرسکو گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہودیوں کی یہی دھمکی بیعتِ عقبۂ اولیٰ کا سبب بن گئی' جس کا حوالہ اجتباء کی مثالوں کے ضمن میں دیا گیا ہے۔ جب مدینہ کے کچھ لوگ مکہ پہنچے اور ان کو حضورؐ کی دعوتِ نبوّت کا علم ہوا تو ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ جلدی کرو اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔ یہ وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی آمد کے یہود منتظر بیٹھے ہیں' مبادا وہ ہم سے سبقت لے جائیں۔ اس طرح حضورؐ پر ایمان لانے اور پھر آپؐ کے اعوان و انصار بننے کی سعادت اہلِ مدینہ کے حصے میں آئی' لیکن یہود کی بدبختی آڑے آئی اور وہ دولتِ ایمان سے محروم رہے۔ اس لئے کہ ان کی عزتِ نفس پر یہ چوٹ پڑی کہ نعمتِ نبوت بنی اسرائیل سے چھن گئی اور یہ اعزاز بنی اسماعیل کو حاصل ہوگیا کہ نبی آخر الزمان ان میں مبعوث کئے گئے۔ ان کا یہی تعصب' ضد' ہٹ دھرمی اور نسلی برتری کا احساس ان کے پاؤں کی بیڑی بن کر رہ گیا اور محرومی ان کا مقدر ٹھہری۔ اسی لئے فرمایا گیا:

وَمَا تَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ

کہ انہوں نے جو تفرقہ و اختلاف کیا تو وہ کسی مغالطے یا ناواقفیت کی بناء پر نہیں' بلکہ ہدایتِ ربانی کے واضح طور پر پہنچ جانے کے بعد محض اپنے نفس کی شرارت و سرکشی اور باہمی ضد کا نتیجہ ہے!

"اجلِ مسمّٰی" کا قانون

آگے فرمایا:

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ

"اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو نکل چکی تیرے رب کی طرف سے ایک وقت مقرر تک تو ان کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا!"

واضح رہے کہ سورۃ الشوریٰ مکی سورت ہے' اور یہاں حضورؐ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ خاطر جمع رکھئے' اللہ کا فیصلہ آکر رہے گا' احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو کر رہے گا۔ لیکن اس میں ابھی وقت لگے گا' کیونکہ ہر چیز کے انجام کے لئے اللہ کا مقرر کردہ ایک اندازہ اور ضابطہ ہے۔ اس فیصلے کے لئے بھی اللہ کی طرف سے ایک میعاد مقرر ہے' اور جب تک وہ گھڑی نہیں آتی تب تک منتظر رہنا پڑے گا!

قرآن کے آئینے میں ہماری تصویر

قرآن حکیم کے بارے میں خود قرآن ہی کے الفاظ ہیں: فِيهِ ذِكْرُكُمْ کہ اس میں تمہارا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ آیتِ زیرِ درس کے اگلے حصے میں قرآن ہمارے سامنے ہماری ہی تصویر پیش کررہا ہے۔ تو آیئے' آئینۂ قرآنی میں اپنی تصویر دیکھئے' اور اگر یہ تصویر بُری نظر آئے تو آئینے کو الزام مت دیجئے کیونکہ آئینہ تو حقیقت کی عکاسی کرتا ہے' بلکہ اپنی شکل کو درست کرنے کی فکر کیجئے! فرمایا:

وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ۝

"اور وہ لوگ جو کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد وہ درحقیقت اس کے بارے میں سخت الجھن میں ڈالنے والے شک میں مبتلا ہیں"

اس وقت قرآن کے ساتھ ہمارا جو معاملہ ہے وہ اس آیت کا مصداقِ کامل ہے۔ اور یہ درحقیقت اس بات پر ہمارا ایمان مضمحل ہوجانے کا نتیجہ ہے کہ قرآن واقعی اللہ کی کتاب ہے' ورنہ یہ ناممکن اور محالِ عقلی ہے کہ ایک طرف ہمارا یہ یقین ہو کہ یہ مالکِ ارض و سماء کا کلام ہے جس کے حضور ہمیں پوری زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے حاضر ہونا

ہے اور دوسری طرف ہم اس سے اعراض اور گریز کا طرزِ عمل بھی روا رکھیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمیں یہ یقین ہو کہ یہ کتاب ہماری زندگی کے ایک ایک گوشے کے لئے رہنمائی فراہم کرتی ہے اور پھر بھی نہ اسے پڑھنے کا ہمارے پاس وقت ہو اور نہ اسے سمجھنے کی ہمیں ضرورت محسوس ہو؟ ہم سب کچھ پڑھیں ' انگریزی ادب میں سکالر ہو جائیں ' دنیا بھر کے علوم و فنون حاصل کر لیں ' ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے عمرِ عزیز کے کئی قیمتی سال صرف کر دیں ' لیکن اگر عربی پڑھنے اور قرآن حکیم کو سمجھنے کی توفیق نہ ہوئی ہو تو یہ دعویٰ کیسے صحیح قرار دیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید پر ہمارا ایمان ہے؟ یہ قرآنی تشخیص ہے جو ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے کہ:

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ ○

قرآن کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ اس کیفیت کے لئے لفظ "شک" پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ "ریب" کا لفظ بھی استعمال فرمایا کہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم جس حالت میں مبتلا ہو وہ محض شک کی نہیں ' بلکہ تمہارے شکوک میں بہت ہی اضطراب انگیز شبہات بھی ہیں۔ اس لئے کہ تمہاری عملی تصویر اس کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

رسالت کا ایک اہم تقاضا: دعوت

اگلی آیت آج کی گفتگو کے مرکز و محور اور عمود کی حیثیت کی حامل ہے اور اس پر کافی غور و تدبر کی ضرورت ہے۔ آیت اپنے حجم کے لحاظ سے بھی طویل ہے اور بہت سے مضامین پر محیط ہے۔ ان میں سے ہر مضمون پر ان شاء اللہ الگ الگ گفتگو بھی ہوگی۔ فرمایا:

فَلِذٰلِکَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ؕ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ ؕ اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا ۚ وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ○

رسالت کی ذمہ داری یہ ہے کہ) آپ اسی (توحید اور دین اسلام) کی دعوت دیتے رہیں' اور جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ خود بھی (توحید اور دین کے تقاضوں پر) مضبوطی سے قائم رہیں' اور ان (مشرکین و کفار) کی خواہشات کا اتباع نہ کریں۔ اور (ان سے صاف صاف) کہہ دیں کہ میں ہر اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل فرمائی ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل (کا نظام قائم) کروں۔ اللہ ہی ہمارا مالک اور پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان (اس بات پر) کسی حجت (دلیل بازی اور جھگڑے) کی ضرورت نہیں۔ اللہ ایک دن ہم سب کو (میدان حشر میں) جمع کردے گا اور (انجام کار کے لحاظ سے) اسی کی طرف پھر جانا ہے!"

یہ آیتِ مبارکہ واضح طور پر دلالت کررہی ہے کہ اس کے مخاطب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آیت کے آغاز میں آنے والے کلمۂ "فا" اور "لامِ" غایت نے 'فَلِکَ' سے مل کر اس آیت کا ماسبق کی آیات سے بھی مکمل ربط قائم کردیا ہے اور اس حکم کا مقصد بھی بیان کردیا ہے۔ نیز اسے اس پس منظر سے بھی مربوط کردیا ہے جو اس پوری سورۃ الشوریٰ کے نزول کے وقت موجود تھا' جس کی چند آیات کا ہم مطالعہ کررہے ہیں۔ یہ سورۂ مبارکہ مکی دور کے وسط کی سورتوں میں سے ایک ہے۔ زمانۂ نزول کے پس منظر میں جو کچھ ہو رہا تھا اسے پیش نظر رکھئے۔ مسلمان' بالخصوص نوجوانوں اور غلاموں کے طبقے میں سے ایمان لانے والوں پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے جارہے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہر قسم کی اذیتیں دی جارہی تھیں۔ یثرب (مدینہ) میں یہودیوں کے مضبوط گڑھ تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ان تک بھی پہنچ چکی تھی' لیکن وہ اور حاملِ کتاب ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود دعوتِ حق کو مٹانے کے لئے مشرکین سے ریشہ دوانیاں کررہے تھے۔ نجران میں نصاریٰ بھی موجود تھے اور ان کی ایک مختصر تعداد مکہ میں بھی موجود تھی۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے اور نصاریٰ نے بھی دین کو بدل دیا تھا۔ انہوں نے شریعت کو ساقط کردیا تھا اور

حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ قرار دے دیا تھا۔ یہود و نصاریٰ میں واضح اختلاف کے علاوہ ان میں سے ہر گروہ میں کئی کئی فرقے تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ مکہ میں قریش اپنے آپ کو حضرت ابراہیم و اسماعیل (علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام) سے منسوب کرتے تھے، لیکن انہوں نے دینِ ابراہیمی کا حلیہ بگاڑ چھوڑا تھا۔ انہوں نے بیت اللہ شریف کو، جو خدائے واحد کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، صنم کدہ بنا دیا تھا اور اس میں تین سو ساٹھ بت رکھ چھوڑے تھے۔ کعبہ کا طواف عریاں حالت میں کرنے کو بڑی نیکی کا عمل قرار دیتے تھے۔ اخلاقی طور پر رذائل و ذمائم کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔

اس صورت حال میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ: فَلِذٰلِکَ فَادْعُ وَ اسْتَقِمْ کَمَاۤ اُمِرْتَ ——— پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ فَلِذٰلِکَ سے پس منظر بھی مراد ہے اور اس آیت کی طرف بھی اشارہ ہے جس سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا، یعنی:

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْکَ وَ مَا وَصَّیْنَا بِہٖۤ اِبْرٰہِیْمَ وَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰۤی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ؕ

"اس (اللہ) نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم نوحؑ کو دیا تھا اور جو ہم نے (اے نبی) آپ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا تھا کہ دین کو قائم کرو اور اس بارے میں تفرقہ میں مت پڑو!"

یہاں پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ فَلِذٰلِکَ فَادْعُ وَ اسْتَقِمْ کَمَاۤ اُمِرْتَ ——— یعنی صیغہ امر میں حضورؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ اسی دین کی دعوت دیتے رہیے اور جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے، اس پر مضبوطی سے جمے رہیے۔ یہ مشرکین و کفار اسے قبول کریں یا نہ کریں، تصدیق کریں یا تکذیب کریں، منظور کریں یا رد کریں، خواہ گالیاں دیں، پتھر ماریں، ایذائیں پہنچائیں اور جان کے دشمن بن جائیں، آپؐ کے فرضِ منصبی کے اعتبار سے آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ اسی کی دعوت دیتے رہیں، کیونکہ دین کی دعوت آپ کا فرضِ منصبی ہے۔ "وَ اسْتَقِمْ کَمَاۤ اُمِرْتَ" کے الفاظ میں اس بات کی مزید تاکید کی گئی کہ اس سے آپ ایک انچ بھی نہیں ہٹ سکتے، آپ کو اس پر جمے رہنا ہے، کوئی مصلحت، کوئی مشکل،

کوئی مصیبت، کوئی نقصان، کوئی خطرہ اور کوئی صدمہ اس دعوت سے منحرف ہونے کے لئے وجہِ جواز نہیں بن سکتا، کیونکہ آپ اس دعوت پر مامور ہیں، آپ اپنی مرضی سے تو نبوت و رسالت کا دعویٰ نہیں کر رہے، آپ نے اپنی سوچ سے تو اس دعوت کا آغاز نہیں کیا۔ یہ دعوت من جانب اللہ ہے۔ آپ اللہ کے رسول اور فرستادہ ہیں، لہٰذا آپ اس منصبِ رسالت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں لگے رہیے!۔۔۔۔۔ آنحضورؐ کو علی الاعلان دعوت پیش کرنے کا حکم ایک دوسرے اسلوب سے سورۃ الحجر میں بایں الفاظ دیا گیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○

"پس (اے نبیؐ!) آپ کو جس (دعوت) کا حکم دیا جا رہا ہے، اس کو ڈنکے کی چوٹ پیش کیجئے اور شرک کرنے والوں کی (مخالفت و مزاحمت کی) بالکل پرواہ نہ کیجئے!"

مصالحانہ رویّہ کی ممانعت

آیتِ زیرِ درس کا اگلا ٹکڑا ہے: وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ "اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو"۔ اس ٹکڑے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہمیں پھر اس ماحول اور پس منظر کی طرف رجوع کرنا ہوگا جس میں یہ ہدایت دی گئی۔ مکی دور کے قریباً نصف میں ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ جب قریش کے مشرک سرداروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس دعوت کا راستہ روکنے کے لئے ان کی ساری کوششیں ناکام ہوگئی ہیں اور اس دعوت کو ظلم و تشدد اور ایذا رسانی کے ذریعے سے دبانا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہر طرح سے ستا کر دیکھ لیا تھا اور آپؐ کے جاں نثار اہلِ ایمان پر بھی تشدد کے پہاڑ توڑے تھے۔ جو کچھ حضرت بلالؓ حضرت خبابؓ بن ارت اور آلِ یاسرؓ کے ساتھ ہوا اس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ حضرت بلالؓ کو تپتی دھوپ میں مکہ کی سنگلاخ زمین پر منہ کے بل گھسیٹا جاتا تھا، لیکن ان کی زبان پر کسی فریاد، کسی فغاں یا کسی آہ و بکاء کے بجائے بس اَحَد، اَحَد کا کلمہ جاری رہتا۔ حضرت خبابؓ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا، ان کے گوشت کے جلنے اور چربی کے پگھلنے سے انگارے ٹھنڈے ہوتے، مگر وہ صبر و ثبات کی چٹان بنے رہے۔ حضرت یاسرؓ

کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں چار۔ سرکش اونٹوں کے ساتھ باندھ کر انہیں مخالف سمتوں میں دوڑا دیا گیا جس سے آپؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سمیہؓ کو ابو جہل لعین نے شرمگاہ میں نیزہ مار کر شہید کر ڈالا۔ حضرت عثمان غنیؓ کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیا کرتے تھے جس سے دم گھٹنے کے قریب ہو جاتا تھا۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مادر زاد ننگا کر کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی والدہ نے بھوک ہڑتال کر دی تھی کہ اگر سعدؓ اپنے آبائی دین پر واپس نہ آیا تو میں بھوکوں مر جاؤں گی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو کئی بار اتنا مارا پیٹا جاتا کہ جان کے لالے پڑ جاتے تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین ۔۔۔۔ غرضیکہ اہل ایمان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا' یہاں تک کہ کچھ لوگ حضورؐ کی اجازت سے ترکِ وطن کر کے حبشہ ہجرت کر گئے۔

جب قریش نے یہ دیکھ لیا کہ مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے ستانے' تکلیفیں پہنچانے اور ظلم و تشدد کی انتہا کر دینے کے باوجود ان میں سے کوئی بھی اس دین سے واپس نہیں پلٹا تب انہوں نے باہمی مشاورت سے فیصلہ کیا کہ اب حضورؐ سے مصالحت کے لئے بات چیت کرنی چاہئے۔ اگر یہ کچھ باتیں ہماری مان لیں اور کچھ ہم ان کی مان لیں تو ہماری ناک بھی نیچی نہیں ہوگی اور ایک مصالحانہ فضا بھی پیدا ہو جائے گی۔ ویسے کچھ لوگ تو اس طرح کی مصالحت کی ضرورت آنحضورؐ کی دعوت کے آغاز ہی سے محسوس کر رہے تھے اور اس کے لئے کوشش بھی کرتے رہے تھے' جس کی طرف سورۂ نٓ (سورۃ القلم) میں اشارہ موجود ہے' جو دعوت کے آغاز کی سورۃ ہے۔ وہاں آنحضورؐ کو ان کی چالوں سے بایں الفاظ مطلع فرما دیا گیا تھا:

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ○ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ○ (آیات ۸'۹)

"پس (اے نبیؐ) آپ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ آپ مداہنت کریں تو یہ بھی مداہنت کا رویہ اختیار کریں۔"

جن لوگوں نے سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ سردارانِ قریش کی جانب سے آنحضورؐ کے پاس وقتاً فوقتاً سفارتیں آتی رہی ہیں اور حضورؐ کو مختلف اوقات میں

مختلف پیشکشیں کی جاتی رہی ہیں۔ حضورؐ سے کہا گیا کہ اگر آپؐ کو اس دعوت کے ذریعے دولت چاہیے تو آپؐ اشارہ کردیجئے، ہم آپؐ کے قدموں میں زر و سیم اور جواہر کے انبار لگا دیں گے۔ اگر آپؐ کو اقتدار کی خواہش اور آپؐ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو------- اگرچہ ہم قبائلی زندگی کے عادی ہیں اور بادشاہت کا نظام ہمارے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتا، پھر بھی------ ہم آپ کو بادشاہ بنانے کے لئے تیار ہیں۔ اگر آپ کسی خاص خاتون سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو اشارہ کردیجئے، وہ خاتون چاہے کسی خاندان کی ہو، آپ کی زوجیت میں دے دی جائے گی۔ انہوں نے مزید پیش کش کی کہ آپؐ جس طرح نماز پڑھنا چاہیں، اپنے معبود کی عبادت کرنا چاہیں، ہم مزاحم نہیں ہونگے۔ ان تمام پیشکشوں کے عوض ہم بس اتنا چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے آبائی دین کو، ہمارے بتوں، ہمارے اس مشرکانہ نظام کو برا کہنا چھوڑ دیں، اس پر تنقید کرنا ترک کردیں۔

ان تمام پیشکشوں کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا وہ اگر تاریخ میں آبِ زر سے لکھا جائے تب بھی اس کی عظمت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ آپؐ نے فرمایا: "اگر تم میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو، تب بھی میں اِس دعوت سے باز نہیں آسکتا------ یا تو میں اس دعوت کی تبلیغ میں اپنی جان دے دوں گا، یا اللہ اس کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے گا!"

اس پورے تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر ان الفاظ مبارکہ کی معنویت پوری طرح واضح ہوتی ہے: فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ--- یعنی اے نبیؐ آپ اپنی دعوت پر ڈٹے رہیے اور اس دینِ حق کی طرف بلاتے رہیے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ یہ مشرکین دام ہم رنگِ زمین بچھا کر چاہتے ہیں کہ مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہوجائے، کچھ لینے اور دینے (Give&Take) کا معاملہ ہوجائے، لیکن آپؐ کو ان کی خواہشاتِ باطلہ کی پیروی کرنے، اپنی دعوت میں کوئی لچک پیدا کرنے اور اپنے موقف میں کوئی کمزوری ظاہر کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

کوئی مانے تو اپنے بھلے کو، نہ مانے تو اس کا وبال بھی اسی کے سر ہے: وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○ اللہ تعالیٰ بڑا غیور ہے، وہ الصّمد ہے، وہ الغنی ہے، وہ ستودہ صفات ہے، وہ اس بات کا محتاج نہیں کہ لوگ اگر اس کا دین صدقِ

صد نہیں مانتے تو چلو پچاس فی صد یا کم و بیش پر ہی معاملہ کر لیا جائے ---- نہیں بلکہ اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ: اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ---- کہ دینِ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ! اس کے دین کو قبول کرنا ہے تو اسے پورا پورا قبول کرنا ہوگا' اس لئے کہ اللہ کے دین میں باطل کی ذرا سی بھی آمیزش ہو گئی تو دین خالص نہ رہے گا اور یوں اللہ کے اس حکم کی خلاف ورزی ہو جائے گی: اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ کہ آگاہ ہو جاؤ' دینِ خالص (اطاعتِ کلی) صرف اللہ کا حق ہے اور اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ یعنی "(اے نبیؐ) ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب برحق نازل کی ہے' لہٰذا آپ اللہ ہی کی بندگی کریں' دین کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے۔" (الزمر:۲)---- حق اور باطل کی آمیزش سے جو مجموعہ بھی وجود میں آئے گا وہ حق نہیں کہلائے گا۔ وہ حقیقت کے اعتبار سے حق نما باطل ہو سکتا ہے' لیکن حق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بقول علامہ اقبال۔

باطل دوئی پسند ہے' حق لا شریک ہے　　شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

اس شعر میں بڑی حکیمانہ بات بیان کی گئی ہے۔ چونکہ خالص اور مجرد باطل کا تو وجود قائم رہ ہی نہیں سکتا' لہٰذا باطل مجبور ہوتا ہے کہ وہ خود کو قائم رکھنے کے لئے حق کا کوئی نہ کوئی جزو اپنے اندر شامل کرے۔ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اور اس کا ذرہ ذرہ اس کے حکم کا پابند ہے' لہٰذا خالص باطل کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ باطل در حقیقت حق و باطل کا ملغوبہ ہوتا ہے اور اس میں حق کا کوئی نہ کوئی جزو شامل ہوتا ہے' جس کی تاثیر سے وہ کچھ نشوونما پاتا ہے۔ اس کی مثال آکاس بیل کی ہے جو کسی ہرے بھرے درخت ہی کے طفیل نشوونما پاتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں یہود و نصاریٰ سے سابقہ پیش آیا تو ان دونوں فریقوں کی بھی یہ کوشش تھی کہ اگر نبی اکرمؐ ان کی خواہشاتِ باطلہ کی پیروی کریں اور ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں مصالحانہ رویہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ بھی کچھ جھکنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا: وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (آیت ۱۲۰) ---- کہ اے نبیؐ! یہ یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ان کے طور طریقوں کی پیروی نہ کریں۔

مشرکین اور اہلِ کتاب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ حضورؐ اس ضمن میں کسی مصالحت کے لئے قطعاً آمادہ نہیں ہوسکتے' چنانچہ ان کی یہ مصالحانہ پیشکشیں دراصل مخلصانہ نہیں ہوتی تھیں بلکہ اپنے زیرِ اثر عوام کو یہ مغالطہ دینے کے لئے ہوتی تھیں کہ ان کی طرف سے تو مصالحت کی کوششیں تواتر کے ساتھ جاری ہیں' مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے موقف پر بضد ہیں۔

ایمان بالکتاب

قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی آیات میں نہایت اہم مضامین کا احاطہ کر لیتا ہے اور اس طرح کوزے میں سمندر بند ہونے کا محاورہ قرآن حکیم کی ہر آیت پر سوئی صد راست آتا ہے۔ چنانچہ اس آیتِ مبارکہ کے اگلے ٹکڑے میں فرمایا گیا:

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ

"(اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ نے جو بھی کتاب نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا!"

آیتِ کریمہ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں بڑے اہم مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں' جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں' لہٰذا صرف اشارات پر اکتفاء کیا جاسکتا ہے۔ یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ برملا ایمان بالکتاب کا اعلان فرما دیجئے۔ یہاں "مِنْ كِتٰبٍ" کی ترکیب خاص طور سے قابلِ غور ہے۔ اس طرح اس بات کو واضح کیا جا رہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن ہی کو جو خود آپؐ پر نازل ہو رہا ہے' منزّل من اللہ تسلیم نہیں کرتے' بلکہ ہر آسمانی کتاب پر ایمان لانے کا اقرار فرماتے ہیں۔ آپؐ کا معاملہ ان لوگوں کا سا نہیں جو تفرقہ میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ تمام آسمانی کتب اور صحیفے دراصل ایک ہی کتابِ ہدایت کے مختلف ایڈیشن ہیں۔ پہلی کتابیں بھی حق تھیں' لیکن وہ محفوظ نہ رہیں' محرّف ہو گئیں۔ اب ہدایتِ ربانی کا آخری اور کامل ایڈیشن یہ قرآن مجید ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان بالکتاب کے اقرار و اعلان کا حکم اس شدّومد کے ساتھ کیوں دیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے فرمایا جا چکا ہے: وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۔

اُس وقت عملاً صورتِ حال یہ تھی کہ مشرکینِ مکہ کا حضورؐ سے ایک اہم مطالبہ یہ بھی تھا کہ آپؐ کو اس قرآن میں تبدیلی کرنا ہو گا یا کوئی دوسرا قرآن پیش کرنا ہو گا' کیونکہ اس قرآن کا موقف انتہائی سخت ہے اور یہ ہمارے معبودوں کی کامل نفی کرتا ہے جنہیں ہمارے آباء و اجداد صدیوں سے پوجتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن کی بات تسلیم کرنے کا صاف مطلب تو یہ ہوا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کو گمراہ اور کافر و مشرک تسلیم کرلیں۔ لہٰذا آپ قرآن میں تبدیلی اور لچک پیدا کیجئے یا پھر دوسرا قرآن پیش کیجئے۔ سورۂ یونس میں یہ مضمون بڑی صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ فرمایا:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ (آیت ۱۵)

"اور جب انہیں ہماری روشن اور بیّن آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو (آخرت میں) ہم سے ملنے کا یقین نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کی بجائے کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسی میں کچھ ردو بدل کرو! (اے نبیؐ) کہہ دیجئے میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اپنی مرضی سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کروں۔ میں تو خود اس کے اتباع پر مجبور ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے خود بڑے ہولناک دن کے عذاب کا خوف ہے۔"

یہی بات اختصار لیکن انتہائی جامعیت کیساتھ اس آیت میں بیان فرمائی جارہی ہے کہ: **وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ** "برملا کہہ دیجئے کہ میں تو خود یقینِ محکم رکھتا ہوں اس پر جو اللہ نے کتاب میں سے مجھ پر نازل کیا ہے"

اگر میں یہ باتیں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوتا تو مجھے اس میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار بھی ہوتا۔ اگر یہ میرے اپنے نظریات ہوتے' میرا اپنا پروگرام ہوتا' اپنا پارٹی منشور ہوتا جس کو چند لوگوں نے مل جل کر باہمی مشاورت سے بنایا ہوتا تو مصلحت کے پیش نظر اس میں ردو بدل یا تنسیخ و ترمیم کا معاملہ ہو سکتا تھا۔ ہماری سیاسی پارٹیاں تو آئے دن وقتی کامیابی اور مصلحت کی خاطر اپنے بنیادی اصولوں تک میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہیں۔ ایک طرف یہ دعویٰ کہ ہمارا

اسلام دشمنوں سے اتحاد کر لیا جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ علی الاعلان کہہ دیجئے کہ میں تو قرآن کا ایک شوشہ تک بدلنے کا مجاز نہیں ہوں' میں خود اس کا پابند ہوں جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے' جیسا کہ سورۂ یونس کے ضمن میں حوالہ دیا جا چکا۔ **القرآنُ یفسّر بعضہٗ بعضاً** (قرآن کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصے کی تفسیر بیان کرتا ہے) کے اصول کے پیش نظر سورۂ یونس کی ایک اور آیت ملاحظہ کیجئے:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (آیت ۳۷)

"اور یہ قرآن وہ چیز ہے ہی نہیں جو اللہ (کی ہدایت) کے بغیر گھڑ لی جائے' بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق اور "الکتاب" کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کائنات کے پروردگار کی طرف سے ہے۔"

نظامِ عدل کا قیام

اس سے اگلے ٹکڑے میں فرمایا گیا:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ط

"اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان (نظام) عدل قائم کروں!"

سورۂ ھود کے آغاز میں' جو زمانہ نزول کے لحاظ سے مکی سورت ہے' یہ اصول بیان ہوا کہ:

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ○

"ال ر۔ یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں' پھر ان کی تفصیل کی گئی اس (اللہ) کی طرف سے جو بڑا دانا اور باخبر ہے۔"

مطلب یہ ہوا کہ نزولِ قرآن کے ابتدائی یعنی مکی دور میں چھوٹی چھوٹی آیات میں وہ بنیادی احکام اور اٹل اصول بیان فرمائے گئے جن پر دعوت اسلامی اٹھ رہی تھی اور جو اقامتِ دین کی جدّوجہد کے اساسی اور اصولی نکات کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر دعوتِ اسلامی کے تدریجی ارتقاء کے دوران مختلف مراحل میں ان ہی نکات کی شرح و تفصیل کی گئی۔ مثال کے طور پر سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات پر' جو آغازِ وحی کے دور کی آیات ہیں' تدبر کیجئے۔ فرمایا:

يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○

"اے لحاف اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جایئے اور (لوگوں کو ان کے عقائد و اعمال کے انجام بد سے) خبردار کیجئے' اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کیجئے!"

ان آیات میں سے تیسری آیت (وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ) خاص طور سے لائق توجہ ہے۔ تکبیر کا لغوی مطلب کسی کو بڑا کرنا ہے۔ یعنی کسی بالا تر اقتدار کی بالادستی اور کبریائی کا اقرار' اعلان اور قیام اس کی "تکبیر" ہے۔ "تکبیر رب" کے حکم میں فصاحت و بلاغت اور ایجاز و اختصار کے لحاظ سے دعوتِ اسلامی کا ہدف مقصود مکمل طور پر موجود ہے' لیکن آگے چل کر اس جدوجہد کے مختلف مراحل میں حسبِ موقع اس حکم کی تفصیل و تشریح کی گئی۔ جیسے سورۃ التوبہ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصف (مدنی دور کی سُور) میں اس مفہوم و مدعا کو اسطرح واضح کیا گیا ہے کہ:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

"وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الھدٰی (قرآن مجید) اور دینِ حق (نظامِ عدلِ اجتماعی) دے کر تاکہ وہ اس (دین) کو تمام جنس دین (نظام ہائے اطاعت) پر غالب کر دے!"

اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۳ میں فرمایا:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ

"اور ان (مشرکوں) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہنے پائے اور دین (نظام اطاعت) صرف اللہ ہی کا ہو جائے!"

آیتِ زیرِ درس میں یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے اجمال کے ساتھ بطورِ اصول بیان ہوئی ہے جس میں حضورؐ سے برملا اعلان کرنے کا کہا گیا کہ آپؐ فرما دیجئے کہ:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ

"اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان (نظامِ) عدل قائم کروں!

یعنی میں محض واعظ اور مبلغ بن کر نہیں آیا۔ اگر تم اس مغالطے میں مبتلا ہو تو حقیقت نفس الامری سے بہت دور ہو ـــــ مجھے تو حکم ملا ہے کہ تمہارے مابین اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کروں۔ میرا موقف تو یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب اور شریعت کے مطابق یہ نظام عدل قائم نہیں ہوتا میرا مشن تکمیل نہیں پاتا۔ میں شاہد بھی ہوں' مبشر

ونذیر بھی اور داعی الی الخیر بھی ہوں، مذکّر و واعظ، مربّی و مزکّی، معلّم و مدرّس اور رحمت و رأفت بھی ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس پر بھی مامور ہوں کہ میں عدل و انصاف کا نظام قائم کروں، لوگوں کے مابین موجود ظلم و استحصال ختم کروں اور بحیثیت رسول، اللہ کے دین (نظامِ حیات) کو تمام نظام ہائے زندگی اور نظام ہائے اطاعت پر غالب کروں۔ (لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ)

حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہم نے کتاب اللہ سے رہنمائی اور ہدایت طلب کرنا چھوڑ دی [4] اسے صرف حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بنالیا اور اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر احتراماً طاقوں کی زینت بنادیا تو ہم اس مقصد ہی کو فراموش کر بیٹھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا امتیازی مقصد اور ختمِ نبوت کا لازمی تقاضا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس وہ نظامِ عدلِ اجتماعی قائم فرمائیں جو ظلم و جور اور تعدّی سے پاک ہو۔ ظاہر ہے کہ اس عادلانہ نظام کا دستور اللہ تعالیٰ ہی مرحمت فرماسکتا ہے جو مالک الملک، احکم الحاکمین اور رب العالمین ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں یہ نظامِ عدل و قسط جزیرہ نمائے عرب کی حد تک قائم فرمادیا اور اپنے بعد یہ فریضہ امت کے سپرد فرمایا۔

نظامِ عدل کی ہمہ گیری

عادلانہ نظام اسی نظامِ حیات اور دستورِ زندگی کو کہا جاسکتا ہے جو زندگی کے محض ایک جزو سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ انسان کی انفرادی و اجتماعی پوری زندگی پر محیط ہو۔ یہ عدل اعتقادی و نظریاتی بھی ہوگا، یعنی اس کی اساس توحید ہوگی اور یہ ہر قسم کے شرک کی نجاست سے پاک ہوگا۔ یہ نظام عبد اور معبود کے مابین صحیح تعلق بھی قائم کرے گا۔ یہ بندے کو بتائے گا کہ اس کے مالک کے حقوق کیا ہیں اور اس کی ایسی تعلیم و تربیت کرے گا کہ جس کی بدولت وہ دل کی آمادگی، شوق و ذوق اور والہانہ محبت کے ساتھ ان حقوق کی ادائیگی کے لئے ہمہ وقت تیار بلکہ بے قرار رہے گا۔ یہ عدل معاشی میدان میں بھی ہوگا، جیسا کہ سورۃ الحشر میں فرمایا گیا: كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (آیت ۷) "تاکہ (مال و اسباب اور دولت) صرف تمہارے تونگروں ہی کے درمیان گردش میں نہ رہیں!" لہٰذا اس نظامِ عدل میں ایسے تمام طور

طریقے استعمال کئے جائیں گے کہ سرمایہ صرف امیروں کے الٹ پھیر میں نہ رہ جائے ---
اور یہ عدل معاشرتی میدان میں بھی ہوگا۔ اس نظام عدل میں نہ تو کسی کو نسل و نسب، رنگ و زبان اور وطن و مکان کی بنیاد پر کوئی امتیاز حاصل ہوگا اور نہ ہی مال و منال، منصب و وجاہت اور شہرت و حشمت کی بنیاد پر کوئی عزّ و شرف حاصل ہوگا۔ بلکہ فضیلت و امتیاز کا معیار صرف "تقویٰ" ہوگا، از روئے الفاظِ قرآنی: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شرف والا وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو! ---
پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہلوا کر کہ "اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ" ان تمام امور کا احاطہ کرلیا گیا جو عدل کے مفہوم و مدعا کا لازمی تقاضا ہے۔ اسی کا نام اقامتِ دین اور اظہارِ دین ہے۔ اسی کا حکم حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ" کے الفاظ میں دیا گیا --- اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو امتیازی شان ہی یہ مقرر ہوئی کہ وہ اس حکم کی بالفعل تکمیل فرمائیں تاکہ تا قیامِ قیامت بنی نوعِ انسان پر اللہ تعالیٰ کی حجت قائم ہو جائے!

الکتاب والمیزان

میں چاہتا ہوں کہ اس گفتگو کے اختتام سے قبل اس موقع پر آپ کے سامنے اسی سورۃ الشوریٰ کی سترہویں آیت اور سورۃ الحدید کی پچیسویں آیت کا حوالہ بھی پیش کردیا جائے جو درحقیقت اسی ارشاد ربانی کی شرح ہے کہ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ---- چنانچہ سورۃ الشوریٰ کی سترہویں آیت کی ابتداء میں فرمایا:

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ

"وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ الکتاب (قرآن مجید) اور المیزان (شریعت) نازل فرمائی ہے!"

اور سورۃ الحدید کی ۲۵ویں آیت میں فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

"بے شک ہم نے اپنے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ

الکتاب اور المیزان اتاری تاکہ لوگ عدل پر قائم ہو جائیں!"

ان دونوں آیات کا مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہنمائی کے لئے جتنے بھی رسول مبعوث فرمائے اور جتنی بھی کتابیں نازل فرمائیں ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ رسول ان کتبِ الٰہی کے ذریعے وہ المیزان نصب کردیں جس سے ایک ایسا انسانی معاشرہ وجود میں آئے جس کی اساس عدل و قسط پر قائم ہو۔ عادلانہ نظام کی صحیح تعبیر کے لئے "المیزان" (ترازو) سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو استعمال فرماتے۔ میزان (ترازو) کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز کو تولتا ہے اور اس کے صحیح وزن کو مقرر کرتا ہے۔ چنانچہ دینِ حق در حقیقت "المیزان" ہے جس میں ہر ایک کا حق متعین کر دیا گیا ہے۔ اللہ کا دین یہ بتاتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے، کس پر کیا واجب ہے، فرائض کیا ہیں اور حقوق کیا ہیں اور ان کے مابین توازن کس قدر ضروری ہے اور ان کی بالفعل ادائیگی کس طرح سے ہونی ہے۔

اس "المیزان" کے قیام اور اس کو بروئے عمل لانے کے لئے قوتِ نافذہ ضروری ہے اور اس قوتِ نافذہ (حکومت) کو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے تابع کر دینا ہی اقامتِ دین و اظہارِ دین ہے۔ جب تک یہ فرض انجام نہ دیا جائے یا انجام دینے کی سعی و جہد میں اپنے جسم و جان کی توانائیاں نہ لگائی جائیں اور اپنا مال نہ کھپایا جائے، ایمان باللہ، ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرت کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ دین کے حصے بخرے کر دینے اور نظامِ سیاست و حکومت کو دین سے علیحدہ کر کے محض وعظ و نصیحت اور عبادات و نوافل کے فضائل بیان کر دینے سے دین کا منشا پورا نہیں ہوتا۔

خاتمۂ کلام

آگے فرمایا:

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ

"(اے نبیؐ کہہ دو) اللہ ہی ہمارا رب ہے اور وہ تمہارا رب بھی ہے!"

لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ

"ہمارے لئے ہمارے اعمال اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں۔"

یعنی میرے اور تمہارے درمیان ایک نزاع اس طرح ختم ہوتا ہے کہ میں جو کچھ پیش کررہا ہوں وہ دین سمجھ کر اور حق سمجھ کر پیش کر رہا ہوں' میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے اپنا فرض سمجھ کر کر رہا ہوں اور اس کی جزاء میں اپنے رب سے پاؤں گا۔ تم جو کچھ کر رہے ہو اس کے بارے میں خود غور کرو' اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو' اگر یہ نفس پرستی ہے' بددیانتی ہے تو اس کی جوابدہی تم کو کرنا ہوگی۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ

ہمارے تمہارے درمیان حجت بازی' بحث و تمحیص اور مناظرے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

اللہ تعالیٰ ہی ہم سب کو جمع کرے گا۔ ایک دن وہ آئے گا جس دن تمام معاملات طے ہو جائیں گے اور آخر کار اسی کی طرف ہم سب کو لوٹ جانا ہے۔ سارے معاملات وہاں فیصل ہونگے کہ کس کی کیا ذمہ داری تھی اور اس نے بالفعل کیا کیا؟ کس کا کیا موقف تھا؟ وہاں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔

آخر میں میں چاہتا ہوں کہ "اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ" کے حکم کو آپ ان اصطلاحات کے ساتھ اپنے ذہنوں میں تازہ کرلیں جو اس سلسلۂ تقاریر میں بیان کی گئیں۔ دین کا بنیادی اور اساسی تقاضا اور اس کی پہلی منزل "عبادتِ رب" ہے' جس کا لازمی تقاضا "فریضۂ شہادت علی الناس" کی ادائیگی ہے' جو دین کی عمارت کی دوسری اور بلند تر منزل ہے۔ جبکہ اس کا حتمی اور تکمیلی تقاضا اور بلند ترین منزل "اقامتِ دین ہے"!!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۝

اقول قولی هذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ۝۝